بیس ۲۰ نئی کہانیاں

مرتّب

علی احمد فاطمی

نصرت پبلشرز۔ کیور مارکیٹ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳

بار اوّل : جولائی ۱۹۷۸ء

تعداد : چھ سو

کتابت : فیاض احمد، ۳ غالب روڈ

طباعت : اسرار کریمی پریس، الہ آباد

قیمت : ۱۵ روپے

:- پبلشر :-

نصرت پبلشرز، کپور مارکیٹ وکٹوریہ اسٹریٹ

لکھنؤ ۳

باجی (والدہ) کے نام

جن کی

ممتا اور پیار بھری دعائیں میری ہر پریشانیوں کا حل ہیں

فاطمی

فہرست

نئی نسل کی نئی کہانی ---- ڈاکٹر سید محمد عقیل ---- ۷

۱۔ کونپل ---- انور سجاد ---- ۱۷

۲۔ آنے والے لوگ ---- افسر آذر ---- ۳۲

۳۔ سواری ---- خالدہ اصغر ---- ۴۵

۴۔ "تج دو تج دو" ---- غیاث احمد گدی ---- ۶۶

۵۔ بیر بہوٹی ---- اقبال متین ---- ۹۰

۶۔ کھا کھا ---- قاضی عبدالستار ---- ۱۰۶

۷۔ مدافعت ---- اقبال مجید ---- ۱۱۵

۸۔ کتھا ایک پیپل کی ---- جوگندر پال ---- ۱۲۶

۹۔ پناہ گاہ ---- رتن سنگھ ---- ۱۴۰

۱۰۔ سوا نیزہ پر سورج ---- عابد سہیل ---- ۱۴۹

۱۱۔ بجوکا ---- سریندر پرکاش ---- ۱۵۸

۱۲۔ کالے ناگ کے پجاری ---- سلام بن رزاق ---- ۱۶۸

۱۳ــ بھیڑیں .... انور خاں ۱۷۷

۱۴ــ "یکہ" .... شوکت حیات ۱۸۴

۱۵ــ آتم کتھا .... حسین الحق ۱۹۲

۱۶ــ اوس اور کرن .... عبد الصمد ۱۹۸

۱۷ــ گرمی .... انور قمر ۲۰۸

۱۸ــ نُچا ہوا گلاب .... شفق ۲۱۸

۱۹ــ ایک منٹ اور .... شارق ادیب ۲۳۵

۲۰ــ سورج کے چکر .... سیّد محمّد اشرف ۲۴۰

یہ انتخاب .... علی احمد فاطمی ۲۵۰

نئی نسل کی نئی کہانی

ھا

یہ بات بہت امید افزا ہے کہ اُردو کہانی کی جدید سے جدید ترین نسل خود کو معنوی بُعد اور ذہنی الجھاوے سے نکال کر تفہیم و ترسیل کے راستے کی تلاش میں ذہن کی کُھلی فضا میں نکلتی نظر آتی ہے۔ آج سے دس بارہ سال پہلے کہانی کی دنیا میں ابہام سے لایعنیت کی جو فضا پیدا ہوئی تھی اور جسے کہانی کا جدید ترین فن بتایا جاتا تھا، اُس کا دور ختم ہوا۔ نئی آگہی اور نئے ادبی مزاج کا ادراک، نئی نسل اپنے ڈھنگ سے کر رہی ہے۔ یہ بات اچھی اس لئے بھی ہے کہ نئے کہانی کار نے نقالی اور روایت پرستی کے ساتھ فیشن کو اپنا رہبر نہ بنا کر، اپنی نجی بصیرت، سوچ اور تجربوں پر بھروسہ کیا ہے۔ اور انھیں دوسروں تک پہنچا بھی رہا ہے یا کم از کم اپنے سماج کو اپنے ساتھ شریک رکھنا چاہتا ہے۔

نئی نسل کی نئی کہانی کو ۱۹۷۰ء کے گرد و پیش سے سمجھنا مناسب ہے۔ ان میں خصوصاً نوعمر لکھنے والے جنھوں نے نئی حسیت اور فن کے نئے راستوں کو اپنا کر کہانی لکھنا شروع کیا ہے اور اپنی حقیقتوں کو اپنی زندگی کے آئینے میں دیکھ کر کہانی کے لئے قلم اٹھا رہے ہیں۔ اس طرح اُن کی حقیقت نگاری، فرضی اوڑھی ہوئی نہیں بلکہ اُن کے گرد و پیش کی دُنیا سے وجود میں آ رہی ہے جسے کہانی کار بھگت بھی رہا ہے اور جس کے لئے وہ کسی مغالطے میں خود کو پھنسا کر ایک عجوبہ بننا نہیں چاہتا۔ اب اُس نے

اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ حقیقت نگاری ہی ادیب کا اصل فن ہے باقی سب کچھ تزئینِ فن۔ اور یہ حقیقت نگاری اُس وژن کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی جو ادیب کی سماجی زندگی کا وژن ہے۔ بقول جارج لوکاچ:

"کسی ادبی تخلیق کی سچی فنی بصیرت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں پیش کی ہوئی دنیا میں کہاں تک سماجی حقائق کی مکمل تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ اُسی وقت ممکن ہے جب ادیب سماجی ارتقا اور تنزل کی تفہیم کا مکمل ماہر ہو۔ صرف ایسا تجربہ اور ایسی مہارت ہی سماجی اسباب کا تجزیہ اور اُس کے اظہار پر قدرت رکھ سکتے ہیں اور تبھی کوئی فنی پیش کش ایسی غیر پابند تخلیقات کی فطری تزئین بھی بن سکتی ہے۔" [1]

اور اسی لئے نیا کہانی کار، رومانیت اور آدرش واد، دونوں کو چھوڑ کر لمحاتی حقیقتوں اور نری کھری زندگی کے رویوں کو بیان کرنے میں دل چسپی لے رہا ہے کہ رومانیت اور آدرش واد آج کی حقیقتوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکے ہیں۔ اس ملاوٹ کے دور میں رومان اور آدرش، سب اوپر سے اوڑھی ہوئی چیز بن گئے ہیں۔ اس لئے نیا کہانی کار صرف اپنے کو حالات کے سپرد کر کے اپنے قلم سے انھیں حالات کی مسابقت کو پیش کرنا چاہتا ہے۔ رومان اُس کی زندگی میں کہاں رہ گیا اور آدرش سب پرانے ہو چکے۔ جس سچویشن میں انسان ہے، اُس کو حل کر لینا اور اُس کے تمام موڑوں سے کامیاب یا ناکامیاب گزر لینا، یہی اُس کی زندگی کا رومان اور آدرش سب کچھ ہے۔

نئی کہانیوں کا یہ مزاج، بہت کچھ تقسیم کے بعد ہی بننے لگا تھا خاندان کی شکست و ریخت نے تمام آدرشوں کو توڑ کر رکھ دیا اور جیسے جیسے زندگی آگے بڑھتی گئی یہ صورت اور خراب ہوتی گئی۔ اب فرد بڑے کنبے کے لئے اس لئے نہیں جی سکتا کہ کنبہ ہے ہی کہاں۔ کچھ ٹوٹ کر سرحد کے اُس پار،

---

[1] (STUDIES IN EUROPEAN REALISM) اردو ترجمہ راقم الحروف۔

اُسے بے سہارا چھوڑ کر چلا گیا اور جو یہاں رہ گیا، اُس کو اپنے زندہ رہنے کی فکر دامن گیر ہے۔ یہی صورت سرحد اُس پار سے آئے ہوئے لوگوں کی ہوئی۔ ہر فرد اپنی نئی دنیا بسانے کے لئے صرف اپنی اَنا اور بقا کے بل بوتے پر ہی وہ کچھ کر سکتا تھا۔ اور جب یہ محنت شاقہ اسے ہی کرنا تھی تو کیسا خاندان اور کہاں کے آدرش۔ ایک ریٹ ریس (RAT RACE) اور سیڈ ریس کے ساتھ افراد اپنی جڑیں پکڑنے اور انھیں مضبوط کرنے میں لگ گئے، خود غرضی، بے اعتباری، یادِ ماضی، اُجڑنے کا غم، نئی بستیاں بسانے میں بھی اپنی روایات کی تلاش، اپنے نئے ملک میں آباد ہو کر بھی اجنبیت اور مہاجرانہ نفسیات کے کچوکوں کو برداشت کرتے میں افراد، جماعتوں اور خاندانوں کا اپنا کچھ باقی نہ رہ گیا۔ نہ ماضی، نہ مستقبل پر اعتبار۔ بس حال ہی حال، جیسا کچھ ہے اور جو کچھ ہے۔

"غلام علی کے گھر کی چھت پر ایک عورت کھڑی تھی۔ ضلع ہردوئی کی ایک لڑکی جو یہاں آ کر بڑے گھیر کی شلوار پہننے لگی تھی۔ اُس کے بال بکھر گئے تھے اور دوپٹہ زور زور سے ہوا میں اُڑ رہا تھا۔

میں نے نواب کو دیکھا اُس نے مجھے دیکھا اور ہم دونوں نے اُس پنکھ ٹوٹی مرغابی کو دیکھا۔ پرندے تیرے پنکھ ٹوٹ گئے۔ تو اب واپس برف کے میدانوں میں نہیں جا سکتا۔ خدا حافظ۔ اے معصوم عورت تو کبھی اُس سرزمین کو نہ دیکھ سکے گی جہاں تیرا شعور بیدار ہوا۔ جہاں تو نے ساون کے جھولے جھولے تھے۔ جہاں مرغی کے ڈربے میں چھپ کر تو نے آنکھ مچولیاں کھیلی تھیں۔ ...... سب بھول جا میری پیاری بہن۔ بس یہ آخری آنسو ہیں۔ اب کوئی آنسو نہ بہے کہ کچھ اور لوگ بھی بے حد اداس ہیں۔ تالاب کی سطح پر پھڑکنے سے کیا فائدہ۔ آڑ میں چھپے شکاری نے تیرے پر کب کے توڑ دیئے۔ اب کیا دھرا ہے!

میں نے گردن موڑ کر سیٹ سے ٹکالی۔ جیپ کچے ڈگرے پر دھول اڑاتی بھاگتی رہی۔"

(ڈار سے بچھڑے۔ سید محمد اشرف)

"ہم پر یہ غم ٹوٹا کہ ہم نے دونوں ہی فصلیں دیکھیں۔ ایک وہ جو قیامت کی بارش کے رکتے ہی زمین سے برآمد ہوئی تھی اور پھر اُس فصل کو نشو و نما پاتے دیکھا کہ جس نے برسوں اور دہائیوں کے بعد زمین سے سر نکالا تھا۔ جس کے نتیجے میں 'ہم' کئی خانوں میں بٹے ہوئے 'ہم' ہو گئے ہیں۔ ہر خانے میں بکھرے ہوئے۔ ہر خانے میں سمٹے ہوئے۔"

(احمد یوسف۔ روشنائی کی کشتیاں)

تاہم نئے کہانی کار، موت کی گھاٹیوں سے باہر نکل آئے ہیں۔ وہ زندگی کے حامی بن رہے ہیں۔ اگرچہ اس زندگی میں بڑی کشمکش اور بڑا سنگھرش ہے۔ ادھر جو دو چار نئی کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ اُن کے تیور دوسرے ہیں۔ وہ تنہائی کا مسئلہ نہیں بنتے بلکہ حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں لگے ہوئے ہیں۔ بدلتے ہوئے نئے سماج کی آگہی اُن کے افسانوں کا موضوع بن رہی ہے جس میں اگر ایک طرف حویلیاں ٹوٹ کر اُن کے ملبوں پر کرگھے اور مشینیں لگ رہی ہیں تو دوسری طرف گندگی اٹھانے والی سرون کمار کی درو پدی، پنڈتانیوں اور ٹھکرائیوں سے کلّہ بہ کلّہ لڑنے کو تیار ہے جس کی نئی بیداری کی وجہ سے مندروں کی پاکیزگی بھی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تبدیلی پریم چند کی سلیا اور دھنیا کی بے بس زندگی اور علی عباس حسینی کے چمار ٹولے سے ہزاروں قدم آگے کی تبدیلی ہے۔ نئی چیتنا، حویلیوں کے ملبوں اور اُن کی شان کے بگڑ جانے پر افسوس نہیں کرتی بلکہ کرگھے اور مشینیں اس طرح لگا رہی ہے کہ یہ تبدیلی زندگی کا اگلا قدم معلوم ہوتی ہے اور لازمی نتیجہ بھی۔ نئی نسل کا یہ اقدام حالات سے سمجھوتہ بھی نہیں بلکہ حالات کا رُخ سمجھ کر زندگی کے دھارے کے ساتھ چلنا ہے۔ نئی نسل، دھوکے، بہلاوے اور بھرم کی دنیا میں رہنا نہیں چاہتی اور نہ وعدوں پر رہنا اُس نے سیکھا ہے۔ "کارزارِ حیات میں سیدھے کو دوا اور اپنا راستہ بناؤ" پر عمل کر کے نئی نسل، سماج اور ادب سب کو بدلنے کی کوشش میں ہے۔ اور یہ کوشش چوبی (WOODEN) انداز میں نہیں بلکہ کہانی کے اپنے انداز میں ہو رہی ہے۔ اس کے معنی

یہ ہیں کہ جدید سے جدید تر کہانی کار جس میں سلام بن رزاق، انور خاں، حسین الحق، سید محمد اشرف، انور قمر، حمید سہروردی، انیس رفیع، شفق، شارق ادیب، طارق چھتاری، ابن کنول اور انور نزہت شامل ہیں، کہانی کو پھر کہانی کی پہلی شرط یعنی قصہ پن کی طرف واپس لانے میں کوشاں ہیں۔ جدید سے جدید تر کہانی کار، کہانی کو معمہ نہیں بناتے۔ ہاں جذبات اور فکر کو روک کر بہت سی کڑیوں کو جوڑ لینے کا موقع ضرور فراہم کرتے ہیں جس کی وجہ سے کہانیاں اکہری سطح اور فارمولے کی کہانیاں بننے سے بچ جاتی ہیں لیکن اُن کی فضا سے کہانی کار کے ذہن پر چھائی ہوئی معنویت اور اُس کے فکر پر مسلط، درد و کرب کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔

نئے کہانی کار کے یہاں، کہانی لکھنے کا عمل بہت سُست ہے۔ ترقی پسندوں کے ابتدائی دور کے کہانی کار جس طرح پے درپے ایک سے ایک اچھی کہانیاں پیش کرتے جاتے تھے، وہ صورتِ حال یہاں نظر نہیں آتی۔ شاید نیا کہانی کار، کار زارِ حیات کے الجھیڑوں سے فرصت نہیں پاتا، یا حالات اور واقعات اس تیزی سے اپنے ستقر بدلتے جاتے ہیں کہ نیا کہانی کار جب تک ایک واقعہ کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے، متعدد صورتیں بگڑ کر بن چکی ہوئی ہوتی ہیں جس سے نئے کہانی کار کا دم اُکھڑ جاتا ہے۔ یا پھر اُس کی گرفت میں کوئی کمی ہے۔ بہر حال کوئی صورت ضرور اردو کے کہانی کار کے ساتھ ہے جس سے اردو کی نئی کہانی کا عمل بہت سُست ہے۔ وہ زندگی کے تمام رخوں میں اپنی کہانیاں تلاش نہیں کر رہا۔ کرشن چندر نے عابد سہیل کو نصیحت کی تھی:

"دیکھو سہیل، خواب دیکھنا کبھی بند نہ کرنا۔ خواب جہاں نہیں ہوتے وہاں اچھی اور بڑی حقیقتیں بھی جنم نہیں لیتیں وہاں ماضی بھی بے معنی ہو جاتا ہے، حال بھی کرب ناک اور مستقبل بھی اندھیرا، تاریک اور سیاہ۔"

شاید نیا کہانی کار خواب کم دیکھ رہا ہے یا خواب دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ تلخ حقیقتیں اُسے آنکھ بند کرنے نہیں دیتیں۔ یا محض تساہل اور سہل انکاری، اُس کے سدِّ راہ ہیں۔ کہانیاں نہیں لکھوگے تو زندگی کی طرف تم اپنے رویّے کا ثبوت کہاں سے فراہم کروگے دوستو؟ اور تہذیب کی دوڑ میں تمھارا کیا حصّہ ہوگا۔ اقبال مجید کے "دو بھیگے ہوئے لوگ" اور مینرا کے "وہ" کی طرح فائیزا (FOSSIL) بننے کی کوشش مت کرو کہ زندگی اور دنیا فائیزا نہیں ہیں۔

دوستو! اگر تم زندگی کی حرکت اور حیات کے ارتقا کے قائل تو اس رواں دواں زندگی سے نئے مسائل اور نئی حقیقتوں کو چُنتے رہو۔ یہ سب تمھارے قلم کے منتظر ہیں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ شہر سے دیہات تک سی۔ پی اِسنو کی دوسری تہذیب یعنی سائنس نے کیا کچھ تبدیلیاں کردی ہیں جو پریم چند نہ دیکھ سکے۔ آج ہل بیل سے زیادہ ٹیکھا، ٹیوب ول، بجلی کی مشین، تھریشر اور ٹریکٹر کا مسئلہ ہے جو ایک طرف زمینداروں کی طرح بڑے کاشتکار پیدا کر رہا ہے جس نے دیہات کی زندگی کو بیل گاڑی کے دور سے نکال تو لیا ہے مگر کھیت مزدور کا مسئلہ نہیں حل کر سکا۔ بھودان کی تحریک زیادہ تر فرضی ہے۔ بے زمین کسان آج بھی بڑے بڑے کاشتکاروں کے پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ قرض اور مہاجن آج بھی دیہات کی زندگی کا بھیانک روپ ہیں۔ یہ سارے مسئلے اور ان مسائل سے دیہات کے کسانوں کی نفسیات، ان کی سماجی زندگی میں کیا کیا پیچیدگیاں پیدا کر رہی ہے۔ ان تمام باتوں کو اپنے فن میں لپیٹ کر پیش کرنا تمھارے حصّے کی چیز ہے۔ شہر کے ٹوٹے پھوٹے آدمیوں کو تلاش کرنے اور اُن کی سماجی زندگی سے اُن کی بدلتی ہوئی نفسیات کی تصویریں پیش کرنا ہی کافی نہیں۔ دیہات کی اس عریض و بسیط دنیا کو بھی پیش کرنے کی فکر کرو کہ ابھی تک پورے ہندوستان کا دیہات اُردو افسانوں میں نہیں دھڑکتا۔ خود پریم چند بھی

صرف یو۔ پی کے دیہات پیش کر سکے۔

آج کے نوجوان ادیبوں کو 'نئی نسل سے تغافل برتنے کی بھی شکایت ہے کہ پرانے اور بڑے ادیب نوجوانوں کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو کچھ لوگوں کا یہ انفرادی معاملہ ہو سکتا ہے۔ ہم ترقی پسند اس بات پر یقین نہیں رکھتے۔ ہمارے نزدیک ادیب اپنے فن، اپنے قلم اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے۔ جس میں صلاحیت ہے اور جو اچھا فن کار ہے وہ صفوں کو توڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ ترقی پسند نظریات کے ماننے والے اس سے خوش ہوتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، اقبال متین، اقبال مجید، رتن سنگھ، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، ان سبھوں کا بارآور ہونا اس بات کا ثبوت ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس نسل نے کبھی اپنی نسل کا نہ تو متھ (MYTH) بنایا اور نہ اسے شکایت ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیا گیا۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ بانس پر چڑھانے سے کوئی بڑا ادیب نہیں بن سکتا۔ ادیب اور افسانہ نگار میں جب تک زندگی کا وژن، محنت شاقہ، زندگی سے لڑ کر حالات سے نپٹنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس وقت تک کوئی حقیقی ادیب اور افسانہ نگار نہیں بنتا۔ قرۃ العین حیدر کے لئے عصمت چغتائی کی طنزیہ کہانی "پوم پوم ڈارلنگ" یاد رکھئے اور دیکھئے کہ "آگ کا دریا" لکھ کر 'پوم پوم ڈارلنگ' نے تمام بزرگوں کو پیچھے چھوڑ کر کسی طرح آگے کی صف میں اپنی جگہ بنالی۔ عبداللہ حسین کو 'اداس نسلیں' سے پہلے کون جانتا تھا۔ عادل رشید مرحوم زندگی بھر ناول لکھتے رہے۔ اُن کی زندگی ہی میں عادل رشید نمبر بھی شائع ہوا مگر اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ناقدین انھیں کیا درجہ دیتے ہیں، آپ جانتے ہیں۔

ایم۔ اسلم، رشید اختر ندوی، صادق سردھنوی، نے بھی تمام عمر ناول لکھے اور بہت سے نام بھی ہیں۔ مثلاً دیا نند ورما اور ان کے افسانوں کا مجموعہ، 'ہم سب اور وہ' 'تیج بہادر کا مجموعہ' جھیلم کے سینے پر' 'ٹھاکر پونچھی' پشکرناتھ، ذکی انور، انجم مانپوری۔ افضل عابدی، ظفر واسطی، مانک ٹالہ، فاطمہ ببین، سلمہ کنول، عفّت موہانی، لیلیٰ لکھنوی، رانو، اور رومانی یا جاسوسی ادب لکھنے والے بہت سے افسانہ نگار اور ناول نگار ان میں سے کتنے ہیں جنھیں نہ بزرگ جانتے ہیں نہ خورد اور نہ جن کی کوئی ادبی حیثیت کبھی معین ہو سکی ہے اور نہ ہو گی۔ انھیں بھی یہی شکایت ہے کہ نقّاد ان کا نام نہیں لیتے۔ ان کے فن کو سراہتے نہیں، اگرچہ بزعم خود وہ بہت بڑے فن کار ہیں۔ مگر یہ کوئی اچھا جذبہ نہیں۔ ہر نسل اور ادیب اپنی سماجی تبدیلیوں، بدلتے ہوئے نئے مسائل، نئے تاریخی موڑ، فن کی نئی ساکھ اور اپنے مجموعی فکر و فن کے تاثّر سے پہچانی جاتی ہے۔ نہ کہ ہر سال کھیتوں کی نئی فصل کی طرح یا ہر سال ایم۔ اے کا امتحان پاس کر لینے سے۔ پرانی نسل، اس نئی نسل کا ساتھ نہ دے سکنے کی وجہ سے پیچھے چھوٹتی جاتی ہے۔

آج اُردو کی نئی کہانی، بزرگوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اُس کے فن، کہانی کے ڈھانچے (STRUCTURE) اور واقعات کے (RECEPTION) میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات معیاری افسانوں کو نظر میں رکھ کر کہی جا رہی ہے۔ نئی کہانی کے بیان میں براہِ راست تبلیغ یا پیغام نہیں، وہ صرف تفہیم کی فکر کر رہی ہے۔ بیانات قاری یا سامع کو ایک طرح کی خود اختیاری سچویشن میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ حالات اور بیانات سے اثر کو تلاش کرے۔ وہ چاہے تو کہانی کا

کے محسوسات کے ساتھ چل سکتا ہے ورنہ کہانی کی فضا سے اپنی سمجھ اور تفہیم کو خود تلاش کر سکتا ہے۔ کہانی کے ابعاد اُسے اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں اگر وہ ساتھ چلنے کی سکت رکھتا ہے۔ یہ خود اختیاری (OPTION) کی صورت، نئی کہانی میں بالکل نئی بات ہے جو قاری اور سامع کے لئے سوچنے کا موقع بھی فراہم کرتی جاتی ہے۔ یہ تبدیلی، علامتیت اور لایعنیت (ABSURDITY) کے بعد کی تبدیلی ہے اور فی الحال اس میں ترقی کے امکانات اچھے ہیں۔ قاری کے لئے خود اختیاری (OPTION) کی صورت، پرانے افسانہ نگاروں کے ابلاغ سے بھی الگ ہے اور جدیدیوں کے خود میں گم ہو جانے والی ترکیب (DEVICE) سے بھی الگ۔ اسے قرۃ العین حیدر کی نسٹالجک جذباتیت میں بھی نہیں شامل کیا جا سکتا۔ اس طرز میں نہ غصہ ہے نہ جھنجھلاہٹ، نہ الزام تراشی۔ بس ایک گہرا تاثراتی بیان جو ذہن کے خانوں سے ہوتا ہوا واقعات میں پھیل گیا ہے۔ آج کی نئی کہانی کا یہی مزاج ہے۔

کہانی کے اس رویے نے، کہانی کی زبان کو بھی متاثر کیا ہے۔ نئی کہانی زبان میں کسی اُلجھاوے کو پسند نہیں کرتی، وہ زیادہ وقت فضا کی تیاری میں بھی صرف نہیں کرتی۔ بلکہ عام فہم ڈھنگ سے اپنی بات کہتی جاتی ہے۔ نیا کہانی کار روایتی اور رسمی گفتگو سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ کبھی سب کچھ ایک سانس میں کہہ لینے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی صرف چشم و ابرو کے اشارے، اس کی زبان میں گفتگو کرنے لگتے ہیں کہ قاری اُس کے دل کی بات پا لیتا ہے۔ یہ اشارے ایسے نہیں ہوتے کہ کہانی کار یہ کہتا ہوا معلوم ہو کر "تم سمجھو یا نہ سمجھو، ہمیں اس کی پروا نہیں"۔ پیچیدگی اور ابہام سے باہر نکل آنے کی یہ صورت، کہانی کی فضا اور اُس کی تمام دلچسپیوں

کو واپس لا رہی ہے۔

نئی کہانی میں معنویت اور مدعا کی یہ باز آفرینی مبارک، جو کہانی کا سلسلہ الف لیلیٰ کی شہرزاد سے پھر جوڑ رہی ہے۔

کہانی کا یہ انتخاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے زیادہ تر نئی نسل کی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانیاں نئے مزاج کی تمام کیفیتوں کی منظہر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ علی احمد فاطمی کا یہ انتخاب اردو کی افسانوی دنیا میں ایک اچھا ذخیرہ ثابت ہوگا +

سید محمد عقیل
شعبۂ اردو
الہ آباد یونی ورسٹی

۲۰ر جولائی ۱۹۷۸ء

انور سجاد

کونپل

بھرے بھرے چہرے پر جابرانہ انداز میں کھنچی کھنچی آنکھیں بھنچے ہونٹ سیاہ نکٹائی کی امریکی گرہ میں پھنسی دوہری گردن، سیاہ کوٹ کی دائیں طرف سینے کی جیب میں ریشمی رومال جس کا سُرخ رنگ وقت کے ساتھ ساتھ فیڈ ہوتا اب پیازی سا معلوم ہوتا ہے۔ داخلی دروازے کے سامنے دیوار پر کیل سے لٹکی اس پورٹریٹ کے فریم کے دائیں کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں پڑتا ہے۔ تصویر لمحہ بھر کے لئے لرزتی ہے۔ کوٹ کے کالر کے کاج پر ایک سنہری پتنگا بیٹھا ہے۔ جو بلب کی روشنی میں بالکل کسی تمغے کی طرح لشکتا ہے۔ چھپکلی اس کی گھات میں وہیں جم جاتی ہے۔

دیوار، چھپکلی، پورٹریٹ، پتنگا، ایک ہی حقیقت کے انگ دکھائی دیتے ہیں۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس، اس علاقے کا انچارج میز پر جھکا بے ضابطے کی کارروائی سرکاری سیاہی چوس پر سرکاری سیاہی سے تحریر کرتا ہے۔ سیاہی چوس پر پہلے ہی سے بنے چند اور کیڑے مکوڑوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس کی گردن اور بھی تن جاتی ہے۔ اسے وہاں کھڑے جانے کا کتنا عرصہ

ہو گیا ہے۔ اسے ہلنے تک کی اجازت نہیں، اس کے بالکل پیچھے ایک قدم ہٹ کے دو سیاہ پوش دائیں بائیں بید لیے کھڑے ہیں۔ جب بھی وہ تھک کر اپنا پورا بوجھ دونوں میں سے کسی ایک ٹانگ پر ڈالنا چاہتا ہے ان دونوں کے ہاتھوں میں پکڑے بید زناٹے سے ہوا کو چیرتے ہیں۔ اس کی مضبوط پنڈلیوں پر پڑ کے اُچھلتے ہیں، جبڑوں کے تمام پٹھے تن جاتے ہیں، نظریں سامنے کوٹھڑی کے دروازے کی سلاخوں سے پار، تاریکی کو چیر کے کھڑکی کے راستے سے راہ پاتی ہیں۔

——— میں ابھی لوٹ آؤں گا۔

وہ اپنے بچے کو سینے سے ہٹا کر بیوی کی طرف دیکھتا ہے۔ بیوی گم سُم اسے دیکھتی ہے، بچہ بھاگ کر صحن میں چلا جاتا ہے۔

——— تم نے کیا جرم کیا پُتر؟

اس کی ماں کے سفید بال صحن میں آتی ہوئی سرد ہوا سے کانپتے ہیں۔

——— ہمارے خاندان میں آج تک کوئی ——— تم نے کیا کیا ہے؟

بیوی کے پاس کہنے کو کچھ نہیں، بچہ سردی سے بے پروا بے حد خوش چوکڑیاں بھرتا صحن سے واپس آتا ہے۔

——— ابّا، ابّا، وہ۔

بچہ باہر کی طرف اشارہ کرتا ہے اسے بتاتا ہے کہ جو بیج اس نے اپنے بیٹے کو بونے کے لیے دیا تھا اس کی کونپل پھوٹ پڑی ہے۔

کچے صحن کے عین وسط میں چھوٹے سے دائرے کی صورت چنے کنکروں کے درمیان گوڈی شدہ زمین ایک ننھی مُنّی کونپل منوں مٹی کو اپنی تیز کٹار سی نوک سے

پیر کے اُبھری ہے۔

ہاں بیٹے وہ، اس میں ایسے ایسے موہنے لہکتے، سُرخ سُرخ پھول فانوسوں کی صورت میں کھیلیں گے۔ وہ بچّے کو پھر سینے سے لگا کر بھینچتا ہے، الگ کرتا ہے، بیوی کو بھرپور نظروں سے دیکھ ماں کو یقین دلاتا ہے۔

______ ماں! میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جانے مجھے کیوں بلانے آئے ہیں۔ ابھی لوٹ آؤں گا۔

______ پھر یکدم مُڑتا ہے۔

______ باہر سردی ہے بیٹے، سوئٹر پہن لو۔

بچّہ چارپائی پر کھڑا ہے۔ بیوی کا ہاتھ اُسے روکنے کے لئے اٹھتا ہے۔ دروازے کا سہارا لے کر ماں کا دل سستولی میں رکتا ہے۔ وہ ان سب کو تابلوئیں چھوڑ کر تیزی سے قدم اٹھاتا باہر سڑک پر آجاتا ہے۔ دو سیاہ پوش عملاً اسے اٹھا کر جیپ میں پھینک دیتے ہیں۔ جیپ چل پڑتی ہے۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ انچارج بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ پیچھے بیٹھے ہوئے چار سیاہ پوشوں نے اپنے گھٹنوں کے درمیان رائفلوں کو جیپ کے فرش پر کھڑا کر کے ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا ہے۔ وہ ان کے درمیان پھنسا بیٹھا اس قدر وی آئی پی ٹریٹمنٹ پر حیران ہوتا ہے۔ جیپ تیزی سے شاہراہوں پر گہری ہوتی ہوئی شام کی سیاہی پھیلاتی بھاگنے لگتی ہے۔ آسمان پر پھیلتے تاریک بادل ونڈ اسکرین کے فریم میں مہیب صورتوں میں اُٹھتے ہیں۔ اسے فوراً خیال آتا ہے کہ وہ اپنے بچّے کو بتا کر کیوں نہیں آیا کہ تند ہوا تیز بارش اس کی کونپل کے لیے قاتل ہیں۔ جب تک کہ یہ کونپل درخت نہیں بن جاتی اور اس پر موہنے مہکتے،

سُرخ سُرخ پھول فانوسوں کی صورت میں نہیں جھومتے تب تک ـــــــ
مجھے اس کو بتا کر آنا چاہیئے تھا۔
اس کی نظریں کوٹھری کی کھڑکی سے پلٹتی ہیں۔ پورٹریٹ کے داہنے کونے پر چھپکلی کا داہنا پاؤں اسی طرح جما ہے۔ آنکھیں پتنگے پر گڑی ہیں۔ چھپکلی کی دم کا آخیری سِرا دیوار پر ایک ملی میٹر سرکتا ہے۔ پورٹریٹ میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ دیوار کی کیل پر تنی رسّی، جس سے یہ پورٹریٹ لٹکی ہے، ذرا سی تنتی ہے۔ کیل پر محیط رسّی کے نچلے زنگ آلود، بوسیدہ حصے کے چند تاگے ٹوٹتے ہیں۔
انچارج اپنی کلائی گھما کر وقت دیکھتا ہے، سردی کو دونوں ہاتھوں میں رگڑتا ہے، دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ ایک کونے پر مبہم سی آواز آتی ہے۔
وہیں اسی جگہ کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں خودبخود کونے کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ اس کا لہو اس کے جسم میں رک جاتا ہے۔ آنکھیں وہیں گڑ جاتی ہیں، پتلیاں پھیل جاتی ہیں۔ اس کونے میں بنچ پر بیٹھی اس کی ماں اور بیوی اس کو تکے جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولتا ہے، ساتھ ہی اس کا قدم ان کی جانب بڑھنے کے لئے اُٹھتا ہے۔ شاڑ، شاڑ، بید ہوا کو چیرتے اس کے جسم پر برستے ہیں وہ پھر وہیں جم جاتا ہے، اسے ملنے کی اجازت نہیں۔
ـــــــ انھیں یہاں کون لایا ہے۔
اسے کوئی جواب نہیں دیتا۔ انچارج اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے کا ارادہ کرتا ہے۔ پھر چہرے پر کوئی تاثر لائے بغیر پورٹریٹ کو دیکھنے لگتا ہے۔
پورٹریٹ مزید دو سوت نیچے سرک چکی ہے، پتنگا کوٹ کے کاج پر اسی طرح جما

بیٹھا ہے۔ چھپکلی کے دونوں اگلے پیر اب فریم کو پار کر چکے ہیں۔ اس کا بایاں پچھلا پیر فریم کے کونے کے قریب ہے۔ دائیں ٹانگ کی دُم کی سیدھ میں کھنچی ہیں۔

——— بچے کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں ———

وہ بیدوں کے پے بہ پے وار سہتا، بنچ پر بیٹھی عورتوں سے تشویش بھرے لہجوں میں پوچھتا ہے۔

——— اس کے پاس ماسی کو چھوڑ۔

——— میں نے کہا تھا تم بولو گی نہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بھی بولا اس کی زبان کاٹ دی جائے گی۔

انچارج کی نظریں پتنگے کے پروں کا سونا چاٹنے کی خواہش میں، بلٹ کر بڑی بیدردی سے کاٹتی ہے۔ ماں بیوی سہم جاتی ہیں۔

——— یہ بڑی زیادتی ——— ان شریف عورتوں کو یہاں کیوں ———

——— شریف عورتیں ؟

انچارج کے گلے میں قہقہوں کا جھاگ اُبلتا ہے۔ وہ چاروں اور ماں بہنوں کی گالیاں تھوکنے لگتا ہے۔

——— تمھاری ماں بہن شریف عورتیں ؟

اس کے بدن کے لہو میں طوفان آجاتا ہے۔ اس کا چہرہ تمتما اُٹھتا ہے۔

وہ بڑھ کر انچارج کو ———

لیکن دونوں سیاہ پوش اسے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ تیسرا ایک نیم روشن کونے سے برآمد ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اس کی قمیص کو گریبان سے پکڑ کر

پھاڑ دیتا ہے۔ پھٹی قمیص سے اس کے صحت مند تندرست سینے پر سردی کی سنسناہٹ پھیلتی ہے، اس کے جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

انچارج سر سے اشارہ کرتا ہے۔

تیسرا سیاہ پوش اسے اپنے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے باقی دونوں اسے ڈھکیلتے ہیں۔ ماں بیوی اسے دیکھتی ہیں پر چپ ہیں۔ تینوں سیاہ پوش اسے کمرے کی واحد کھڑکی کے پاس لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک اس کی قمیص کے رہے سہے چیتھڑے بھی اتار پھینکتا ہے۔ کھڑکی سے آتی تیز سرد ہوا اس کے جسم کے مساموں میں داخل ہو کر سر اٹھاتی ہے۔ وہ جسم سے اٹھتی کپکپی کو جسم میں دبا دیتا ہے۔ کھڑکی کی چوکھٹ کر دونوں ہتھیلیاں جما کر سینہ پھلاتا ہے۔ لمبا سانس بھرتا ہے۔ اب آسمان پر بادل پوری طرح جم چکے ہیں۔ مدھم مدھم کومل سُرمئی سی روشنی جو تاریک سے تاریک رات میں بھی کہیں سے آجاتی ہے، کڑکتی کوندتی برق کے سامنے ہر لحہ غائب ہوتی ہے۔ ان لمحوں کے بیچ کے لمحے میں پھر آسمان کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس درمیانی لمحے کو وہ اپنے سارے وجود میں سمیٹ کر مسکراتا ہے پلٹتا ہے۔ نظروں ہی نظروں میں ماں اور بیوی کو صبر کی تلقین کرتا ہے۔

——— آپ مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہیں؟

وہ بے صبری سے پلٹ کر سوال کرتا ہے۔

——— آپ مجھے جانے دیں گے یا نہیں۔ میرا بچہ گھر میں تنہا ہے۔

ایک سیاہ پوش ہاتھ میں پلاس لیے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ یکایک اس کا بایاں ہاتھ پکڑ کر پینترا بدلتا ہے۔ اس کا بازو اپنی بغل میں لے کر سختی سے دبا لیتا ہے۔

باقی سیاہ پوش اس کی طرف جھپٹتے ہیں۔ اسے زمین پر گرا کر اپنے قابو میں لے لیتے ہیں۔ پلاس والا اس کی شہادت کی انگلی کا ناخن پلاس کے دانتوں میں دبا کر آہستہ آہستہ کھینچتا ہے، کھینچتا ہے، حتیٰ کہ ناخن جڑ سے اکھڑنے لگتا ہے۔ درد کی تمام حسیات سمٹ کر اس کے ناخنوں میں آجاتی ہیں۔ اس کے اندر کا ایک ایک خلیہ تناؤ میں جھنجھنا اٹھتا ہے، لیکن وہ اپنے چہرے پر اذیت کا کوئی تاثر نہیں آنے دیتا۔

انچارج غور سے اس کے چہرے کو دیکھتا ہے۔

وہ خود دل ہی دل میں حیران ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے کبھی جسمانی اذیت سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ اب یہ کیسی شناسائی ہے کہ اذیت اجنبی محسوس نہیں ہوتی شاید جسم اور دماغ کے ہم آہنگ ہونے پر دونوں حقیقتیں، دونوں اذیتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ انچارج سیاہ پوش سے پلاس چھین کر دیوانہ وار اس کا ہر ناخن کھینچتا ہے کھینچتا ہے۔ اس کے ناخنوں کے کناروں پر خون کی لکیریں ابھر کے محیط ہو جاتی ہیں۔ انچارج تھک کر لرز جاتا ہے۔ پلاس تان کر اس کے پیٹ پر مارتا ہے، گالیاں دیتا ہوا سیاہ پوشوں کے ساتھ کانفرنس کرنے کے لیے پرے ہٹ جاتا ہے۔ ماں بہن کی گالیاں سن کر ماں، بیوی کے سر اور بھی جھک جاتے ہیں۔

وہ اپنے اذیت رسانوں کو مصروف دیکھ کر یکدم کروٹ بدلتا ہے۔ فرش پر پنجوں اور ہتھیلیوں کے بل چپکے سے چلتا ماں اور بیوی کے قدموں میں جا پہنچتا ہے۔

—— بچہ تو محفوظ ہے نا؟ بوڑھی ماسی اس کا کیا خیال؟ ——

ماں اور بیوی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی ہیں۔ وہ کولہوں کے سہارے بیٹھ کر جلدی سے اپنے ہاتھ بغلوں میں داب لیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جلتے پانی کی لکیر دوڑ

جاتی ہے۔

بچّہ تو محفوظ ہے

عین اسی وقت آسمان سے بارش کے پہلے قطرے کا فائر ہوتا ہے۔ بارش مشین گنوں سے چلتی گولیوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بچّہ اپنے لحاف کو ذرا سا اٹھا کر دوسری چارپائی کی اور دیکھتا ہے۔ بہتّر سال کی بوڑھی ماسی لحاف میں دبکی نیند میں غائب غلا ہے۔ بچّہ بہت محتاط، چارپائی کی چرچراہٹ کو دھیرے دھیرے اپنے بس میں کرتا ہے۔ دبے پاؤں چل کر دیوار سے لگا اسٹول اٹھاتا ہے۔ بند دروازے کے سامنے رکھ کر اس پر چڑھتا ہے۔ آہستہ آہستہ کنڈی کھولتا ہے۔ دوسری چارپائی پر قبر سی بنی لحاف کی نیند میں غائب غلا بہتّر سال کی ماسی کو دیکھتا ہے۔ کنڈی کھول کر وہ جلدی سے نیچے اُتر کر اسٹول کو پھر دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہے۔ دروازے کا ایک پٹ کھول کر باہر جھانکتا ہے۔ دیواروں سے اچھلتی بوچھاڑ اس پر پڑتی ہے۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہوا اس کی ناک کی پھننگ سے ٹکراتی ہے۔ بچّہ بڑی مشکل سے چھینک کو دباتا ہے۔ اسے صحن میں کونپل نظر نہیں آتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تیز بارش کا پردہ ہے۔ کارپوریشن کے کھمبے پر جلتے بلب کی روشنی نے بارش کی چادر پر پھیل کر اسے اندھا شیشہ بنا دیا ہے۔ بچّے کے جسم میں سردی کی سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اس کو چھینک آ ہی جاتی ہے۔ دوسرے بستر پر بنی قبر میں جنبش ہوتی ہے۔ بچّہ روہانسا ہو کر فوراً اپنے بستر میں دبک جاتا ہے۔ لحاف کی اوٹ سے ماسی کو دیکھتا ہے۔ ماسی پھر اپنی نیند میں قائم ہو چکی ہے۔

بچّے کا دل مسلسل دھڑکے جاتا ہے، جانے باہر تیز بارش تند ہوا اس کے ننّے نویلے

بوٹے کا کیا حال ہوگا۔ اگر اس بوٹے کو کچھ ہوگیا تو ، اس سے رہا نہیں جاتا۔ وہ بےچینی میں اٹھ کر اپنی تمام حرکات دہراتا ہے۔ دروازے میں کھڑا ہو کر اندھے شیشے کے پار دیکھنے کی سعی کرتا ہے۔ دیواروں سے پھوٹتی پھوار اسے شرابور کردیتی ہے۔

اب ہوا کا رُخ کھڑکی کی طرف ہے۔ جہاں اسے پھر کھڑا کردیا گیا ہے۔ تیز ہوا اس کے جسم پر بارش کی چاندماری کرتی ہے۔ لمحہ بھر کے لئے اس کے جسم کے انچ انچ کو کٹے ہوئے بلیڈ چھیدتے ہیں۔ پھر جلد ہی اس کے جسم اور دماغ کی حقیقتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے سُن جسم پر بلیڈوں کے وار سہتا ہے۔

ماں اور بیوی میں اسے دیکھنے کی تاب نہیں۔ ان دونوں کی نظریں پورٹریٹ پر گڑی ہیں۔ ان کے چہروں پر نفرت اور حقارت، غم و غصے کے تاثرات ہیں۔ چھپکلی پوری کی پوری پورٹریٹ کے فریم کے شیشے پر آچکی ہے۔ سنہری پتنگا کار ج پر تمغہ نہیں رہا۔ رفتہ رفتہ چلتا ہوا سر کے اس حصے پر آکے رک گیا ہے جہاں سے بال چھدرے ہوتے ہوتے ماتھے میں ڈھل جاتے ہیں۔ چھپکلی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ اگلا دایاں پاؤں بڑھائے، پچھلی بائیں ٹانگ دم کی سیدھ میں تان کر گھات لگا لیتی ہے۔ کیل کے اوپر بوسیدہ زنگ آلود رسی کے چند اور تاگے ٹوٹ جاتے ہیں، پورٹریٹ چار سوت کشش ثقل کی طرف کھسکتی ہے۔

اذیت خانے کا داخلی دروازہ کھٹکے سے کھلتا ہے۔ انچارج اور تمام سیاہ پوش اٹنشن ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی کھڑکی سے پلٹ کر دیکھتا ہے۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک شخص برساتی اوڑھے کار سے اُتر کر دو سیاہ پوشوں کی معیت میں داخل ہوتا ہے۔ برساتی اتار کے ایک سیاہ پوش کو تھما دیتا ہے۔ کوٹ کی جیب سے پائپ نکال کر منہ میں دباتا ہے۔

اس کے سامنے چھ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر گیس لائٹر سے پائپ سلگاتا ہے۔ دھوئیں
کے چھوٹے چھوٹے بادل اس کے منہ سے نکلتے ہی کھڑکی سے آتی ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔
کونے سے رونے کی دبی دبی آواز آتی ہے۔ اس کی بیوی اپنے رومال کو منہ میں
ٹھونسے، تھک ہار کر چھلکتے صبر کے پیمانے کو چھلکنے سے روکنے کی کوشش کرتی ہے، پائپ
والا منہ سے پائپ نکال کر اس کی جانب دیکھتا ہے۔

——گڈ——

انچارج بڑے فخر سے اپنی کارگزاری سناتا ہے۔ پائپ والے کا چہرہ مطمئن ہے۔
وہ پائپ والے کی طرف لپکتا ہے۔ دو سیاہ پوش فوراً بڑھ کر اسے پکڑ لیتے ہیں۔

——میرا جرم —— میرا جرم؟ یہ لوگ——

انچارج کی تیز زبان اسے کاٹتی ہے۔ ماں بہن کی گالیاں۔ ماں بیوی کے سر زمین
پر جھکے اٹھ نہیں پاتے۔ انچارج کے اشارے پر ایک سیاہ پوش کونے میں پڑے کڑوے
تیل کے کنستر میں ڈوبا کوڑا نکالتا ہے۔ دو بڑھ کر اسے گھسیٹ کے تاریک کوٹھری کے
جنگلے کے ساتھ اس کی کلائیاں اور پیر باندھ دیتے ہیں، کچھ اس انداز میں جیسے
یسوع مسیح کو سولی پر باندھا گیا تھا۔

سیاہ پوش کوڑے سے زائد تیل نچوڑ کر پائپ والے کو اجازت طلب نظروں
سے دیکھتا ہے۔ پائپ والا منہ میں پائپ رکھ کر کش لیتا ہے۔ سیاہ پوش کوڑا لہراتا ہے۔

پہلا وار۔

اس کے دانت اور آنکھیں بھنچ جاتے ہیں۔ پشت کے ریشے لمحہ بھر کے لیے سن
ہو کر تڑپتے ہیں۔ وار کے بعد اس کا منہ کھلتا ہے۔ آنکھیں جنگلے کے باہر کوٹھری کے

اندھیرے میں شعلے پھینکتی ہیں۔

دوسرا وار، تیسرا، چوتھا۔

اب اس کی پیٹھ کے پٹھوں کے تمام ریشے مسلسل تناؤ میں ہیں، اس کی آنکھیں مسلسل بھنچی ہیں، جن کے سامنے مرکز سے سُرخ نقطہ ابھرتا ہے، افق سے افق تک تنتا ہی چلا جاتا ہے۔ چیخیں ہر وار پر اس کے گلے میں آکے اٹک جاتی ہیں۔ پاپ والا حیران ہے کہ اتنی اذیت کے باوجود یہ چیختا کیوں نہیں۔ اس کی ماں اور بیوی اس منظر کی تاب نہ لاکر بنچ پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کے کاندھے پر سر رکھ کے آنکھیں میچ لیتی ہیں۔ ماں، دوسرے ہاتھ سے اپنی گرم چادر کے دامن میں اپنی بہو کے سر کو بھی چھپا لیتی ہے۔

کوڑے مارنے والا ہانپ کر بیٹھ جاتا ہے۔

اس کے پٹھوں کا تناؤ ختم ہو جاتا ہے۔ آنکھیں کُھلتی ہیں۔ وہ جس طرف دیکھتا ہے، اس کی آنکھوں کے مرکز سے ابھرتا سرخ نقطہ تاریکی کو روشن کرتا افق سے افق تک پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ تھکاوٹ سے چور جنگلے سے بندھا لٹک جاتا ہے۔

پورٹریٹ تین سوت اور نیچے لٹک گئی ہے۔ دو ایک تاگوں کے سوا رسّی کے زنگ آلود حصّے سے تمام تاگے ٹوٹ گئے ہیں۔ پورٹریٹ کے ماتھے پر چھپکلی اور پتنگے کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رہ گیا ہے۔

ایک سیاہ پوش بڑھ کر اس کی کلائیوں اور ٹخنوں سے رسّیاں کھولتا ہے۔ وہ بے جان فرش پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ انچارج اپنے فل بوٹ کی نوک اس کی پیٹھ سے لگا کر زور سے ڈھکیلتا ہے۔

پایپ والا پلٹ کر اسٹول پر پڑی دہکتی کوئلوں کی انگیٹھی پر، جو اس عرصے میں ان میں سے ایک لا کر دھرا گیا ہے، اپنے ہاتھ سینکتا ہے۔ انچارج میز سے کاغذات اٹھا کر اس کے سامنے کرتا ہے۔ پایپ والا پایپ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتا، کاغذات کا سرسری مطالعہ کرتا ہے۔ انچارج کو شاباش دیتا ہے۔ انچارج سیلوٹ کرتا ہے۔ اس کا جی بار بار سیلوٹ کرنے کو چاہتا ہے لیکن اس خیال سے کہ صاحب برا نہ مان جائے، ایک ہی سیلوٹ پر اکتفا کرتا ہے۔

—— یہ لوگ مجھے بلا وجہ گرفتار کر کے لے آئے ہیں۔

پایپ والا مڑ کر اسے دیکھتا ہے۔ وہ فرش پر گھسٹتا اس کے قریب آتا ہے۔ چند قدم پرے رک کر ہانپنے لگتا ہے۔ انچارج اور سیاہ پوش اس کی طرف لپکتے ہیں۔ پایپ والے کے ہاتھ کے اشارے سے رک جاتے ہیں۔

—— بہت ڈھیٹ ہے۔

انچارج کے لہجے میں خفت ہے۔ پایپ والا خاموشی سے فرش کو دیکھتا ہے۔

—— آپ —— آپ —— پڑھے لکھے ہیں۔ افسر تو بعد میں بنے۔ مجھے یاد ہے طالب علمی کے زمانے میں آپ بھی ——

—— شٹ اپ، تم میرے بارے میں اتنا جانتے ہو!

پایپ والے کا چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ پیٹ کا سارا لعاب پل بھر کے لئے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ پایپ والا کش لے کر وہ اس کیفیت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔

فرش پر بیٹھے بیٹھے وہ دیوانہ وار قہقہے میں فرش پر جھک جاتا ہے۔ پایپ والے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔

—— خاموش۔

جی اچھا۔ بہت بہتر و بہت مناسب —— یہ بتائیے، میں چور ہوں، بدمعاش، غنڈہ، جواری، زانی، شرابی، قاتل، ڈاکو یا اسمگلر ہوں، جو مجھے یہاں لایا گیا ہے۔؟

پائپ والا اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ بات اس کی ذات پر خود ہی سمٹ گئی ہے۔

یا میں اپنے وطن کے خلاف کسی سازش میں ملوث ہوں جو آپ مجھے اذیتیں دے کر سازش کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

انچارج ایک طرف کھڑا دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگتا ہے کہ صاحب خواہ مخواہ اسے بکنے کی اجازت دے رہے ہیں۔ وہ ابھی ایک سیکنڈ میں اس کی زبان بند کر سکتا ہے، لیکن پائپ والا اپنے ہر حکم کا جواز دینا چاہتا ہے۔ اگر وہ جواز نہ بھی دے تو بھی اس شخص کو جو فرش پر بیٹھا اپنے آپ کو شریف اور معزز شہری ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

—— میری ماں، میری بیوی کی بے حرمتی۔

وہ تقریباً روہانسا ہو جاتا ہے۔

تمھارا صرف ایک جُرم ہے۔ تم کسان ہو، مزدور ہو، کلرک ہو، شاعر ہو، خطرناک قسم کے بلڈی پوئٹ۔

میں بیک وقت یہ سب کچھ؟!

ایک عرصے سے تم یہ سب کچھ ہو۔ تمھاری فائل کہتی ہے۔ آج دوپہر تم نے

یہ ثابت بھی کر دیا ہے۔

_____ میں نے کچھ ثابت نہیں کرنا چاہا تھا۔

_____ تو پھر تم ہجوم کے درمیان چبوترے پر کھڑے کیا بک رہے تھے؟

_____ آواز کی آرزو میں، وہ خواہش، وہ خیال، وہ لفظ جنھیں میں نے اپنے سمیت اپنے وجود میں سمیٹ لیا تھا، آج ان کی نجات کا دن تھا۔ اور میں، ہجوم کے ساتھ مل کر اس حقیقت کا اعلان کر رہا تھا کہ ہم انسان ہیں، جانور نہیں۔ ہم آزاد ہیں، غلام نہیں۔

_____ تم واقعی خطرناک شاعر ہو۔

_____ میں یہاں ایک ہوں۔ اگر خواہشوں، خیالوں اور لفظوں کو آواز سے روشناس کرانا خطرناک ہے تو باہر سارا ہجوم، سارا شہر، سارا ملک، ساری کائنات خطرناک ہے۔ انھوں نے اپنے مقدر پر لگی جبر و استبداد کی مہریں توڑ ڈالی ہیں۔

پایپ والا بڑے اضطراب سے پایپ کو منہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں جماتا ہے۔

_____ آپ کی بدنصیبی ہے کہ آپ نے مہریں لگانے والی مشین کا پرزہ بننا پسند کیا۔

پایپ والا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ وہ میز کا سہارا لے کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھتا ہے۔ میز کے سہارے کھڑا ہو جاتا ہے۔

_____ تم بہت بولتے ہو۔

پایپ والا جلدی سے پلکیں جھکا کر کہتا ہے۔ سر کے اشارے سے انچارج کو بلا کر اس کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ انچارج کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھتا ہے۔ دو سیاہ پوش اسے وہیں میز کے پاس فرش پر پھر سے گرا دیتے ہیں۔ دو اور ساتھ

مل کر اسے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں۔ انچارج اس کے سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔ اپنے مضبوط ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کو اس کے جبڑوں کے دونوں طرف جما کر پوری قوت سے دباتا ہے۔ وہ مدافعت کرتا ہے لیکن اسے منہ کھولنا ہی پڑتا ہے۔ پائپ والا ایک چھوٹا سا دہکتا ہوا انگارہ بیڈ کے کلپ میں انگیٹھی سے اٹھا کر اس کے قریب لاتا ہے۔ انگارے کی حدت اور سرخی سے اس کی آنکھوں کو سکون پہنچتا ہے۔

——— تم واقعی بہت بکواسی ہو۔

پائپ والا اس کے کھلے منہ کے راستے دہکتا انگارہ اس کی زبان پر رکھتا ہے۔ کونے میں گرم چادر کے نیچے ماں اور بیوی ایک دوسرے کو بھینچ لیتی ہیں۔ وہ سیاہ پوشوں کے شکنجے میں جکڑا تڑپتا ہے، بھینچتا ہے۔ ماں بیوی کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہیں۔ پائپ والا انگارہ اٹھا کر پھر رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے منہ کے لعاب سے انگارہ بجھ جاتا ہے۔ پائپ والا کلپ سمیت انگارہ پرے پھینک کر بڑے اطمینان سے اٹھتا ہے، سوچتا ہے ——— اب یہ سدا کے لئے گونگا ہو گیا۔

عین اسی وقت پورٹریٹ کی رسّی کا ایک اور تاگا ٹوٹتا ہے۔ پورٹریٹ چند سوت اور کشش ثقل کی جانب سرکتی ہے۔ اب صرف ایک اور تاگا رہ گیا ہے جس کے سہارے پورٹریٹ کیل پر ٹنگی ہے۔ چھپکلی اگلا دایاں پاؤں اٹھائے، ماتھے کے تمغے، سنہری پتنگے پر اب جھپٹا ہی چاہتی ہے۔ وہ فرش پر لیٹا اپنے جسم کے تشنج پر قابو پا کر حواس مجتمع کرتا ہے۔ اجتماع میں بھڑکتی جلی زبان سے ان تمام لفظوں کا سیلاب اُمڈا آتا ہے، جو آج دوپہر ہجوم کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے تھے۔ درد، اذیت اور غصے میں جلتی زبان سے لکنت میں ابھرتے الفاظ، پائپ والے اور دیگر سیاہ پوشوں

کی سمجھ میں نہیں آتے۔

یہ سدا کے لیے گونگا ہو گیا۔ اپنی دانست میں ان بے معنی آوازوں کو سنتے ہوئے پائپ والے اور اُس کے حواریوں کے ہونٹ مسکراہٹ میں پھیلتے قہقہوں میں پھٹ پڑتے ہیں۔

قہقہے، کونے سے اُبھرتی ماں اور بیوی کی سسکیاں، اس کی جلی ہوئی الکناتی زبان سے دیوانہ وار نکلتے لفظ اور باہر کڑکتی بجلی، سرد ژندناتی ہوا پر تیز بارش کا ہنتاژ۔ کارپوریشن لیمپ پوسٹ کی روشنی سے بنے، اندھے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بچے کو یکدم ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ دروازے سے ہٹ کر جلدی سے مڑتا ہے۔ پل بھر کے لیے دوسرے بستر پر تنفّس سے ابھرتی ڈوبتی رضائی کی قبر کو دیکھتا ہے۔ اپنی چارپائی کے پاس آ کر جلدی جلدی جوتا پہنتا ہے، اپنی پوری قوت سے، اپنے بستر کا لحاف اٹھا کر اوڑھتا ہے۔ پلٹ کر تیز تیز قدم اُٹھاتا کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ صحن کے عین وسط میں پہنچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اُس کی ننھی منّی کونپل کو اپنے لحاف کے دامن میں لے لیتا ہے، جو منوں مٹّی کو اپنی تیز کٹار سی نوک سے چیر کے ابھری ہے، اور درخت بننے پر جس کی شاخوں سے موہنے، مہکتے، سُرخ سُرخ پھول، فانوسوں کی صورت میں جھولیں گے۔

افسر آذر

آنے والے لوگ

مدقوق، کجلائے اور کمھلائے چہروں پر خوشی کی لہریں تڑپ اٹھیں، آنکھوں کی بجھی ہوئی جوت جاگ اٹھی۔ خشک آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔ جو دل کمزور تھے اس مسرت کا بوجھ برداشت نہ کر پائے۔ خاموش ہو گئے۔ جو زندہ باقی بچے ریڈیو پر یہ اعلان سن کر گھروں سے باہر نکل آئے اور ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

گھروں میں خشک اور لٹکے ہوئے بے شیر پستانوں، دھنسی ہوئی آنکھوں، پچکے ہوئے گالوں، پٹخے ہوئے ہونٹوں اور چمڑی منڈھے پنجروں والی عورتیں بھی خوش تھیں اور وہ پھیلی ہوئی آنکھوں، بڑے بڑے سروں، پسلیاں نکلے ہوئے سینوں اور مٹکے جیسے پیٹ والے بچوں سے حلوے پوری پکانے کی باتیں کر رہی تھیں۔ یہ وہ بچے تھے جنھوں نے اپنے بزرگوں اور بڑے بھائی بہنوں اور اپنے والدین سے لذیذ پکوانوں کے قصے اور داستانیں سنی تھیں اور جب ان کے بزرگ ان پکوانوں

کے ذائقہ کا تصور کر کے چٹخارہ لیتے تو یہ بچے حیران ہوتے تھے کہ آخر یہ یہ لوگ کس طرح ایسی آواز نکال لیتے ہیں۔

ان بچوں نے باہر نکل کر ایک دوسرے کو بتایا کہ کل ان کے ہاں کیا پکے گا، یہ بچے آج نہ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے، نہ گولیاں، نہ لٹو چلا رہے تھے، نہ کبڈی کی پالیاں جمی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر ذکر تھا تو صرف اس بات کا کہ کل ان کے ہاں کیا پکے گا۔

یہ واقعی اتنی ہی بڑی خبر تھی کہ ان کے ہاں تمام دل چسپیاں ہیچ تھیں۔ کچھ شوہروں نے خبر سنتے ہی بے اختیارانہ اپنی بیویوں کو بازوؤں میں اٹھا کر رقص کیا تھا۔ خوشی کے اظہار کے لئے کچھ نے پٹاخے چھوڑے، کچھ نے ٹین کے خالی ڈبے بجائے، اور کچھ نے بجلی کے کھمبوں کو بجایا۔

اس خبر کا تعلق ہر فرد سے تھا۔ لوگ اُبلا ہوا کھانا کھا کر اکتا گئے تھے۔ وہ بگھار کا ذائقہ اور خوشبو تک بھول گئے تھے اور انھیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہ بتانے میں بڑی دقت پیش آئی تھی کہ سالن میں گھی کیسے تیر سکتا ہے۔

ریڈیو سے اعلان ہوا تھا:

بھاری تعداد میں گھی درآمد کرنے کے جو انتظامات کئے گئے تھے ان کے تحت گھی کی پہلی کھیپ پہنچ چکی ہے۔ اس سے ہر شہر، قصبے اور دیہات کو پورا پورا حصہ دیا جائے گا۔

اس اعلان کے ساتھ ہی گھی کے بارے میں سرکاری پالیسی کے بنیادی اصولوں کی وضاحت بھی کی گئی تھی۔

گھی کی قلت اس لئے پیدا کی گئی تھی کہ لوگوں کو اس کی اہمیت کا احساس

ہوجائے اور وہ اس کے استعمال میں احتیاط سے کام لیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ عوام ہر چیز کفایت شعاری سے استعمال کریں تاکہ ترقیاتی منصوبوں کے لئے وسائل کی کمی نہ رہے کیونکہ ترقی کے بغیر خوش حالی ممکن نہیں۔

اس قسم کی باتیں وہ گذشتہ دس برس سے سنتے چلے آرہے تھے۔ مگر ابھی تک خوش حالی کی پہلی لہر بھی ان تک نہ پہنچی تھی بلکہ ان کی ضروریاتِ زندگی دن بدن محدود ہوتی چلی جارہی تھی۔

مگر آج ریڈیو نے گھی کی آمد کی خبر دیتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ گھی کی درآمد اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ خوش حالی کا دور شروع ہو چکا ہے۔

خبروں کے بعد تبصرے میں کہا گیا تھا "گھی درآمد کرنے کا فیصلہ محض عوام کی خاطر کیا گیا ہے حالانکہ ہماری معیشت اتنی مستحکم نہیں کہ گھی ایسی شے پر زرِ مبادلہ ضائع کیا جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ چینی کی قلت یا اس کی قیمت میں ذرا سے اضافے پر حکومتیں تبدیل کردی جاتی تھیں اور کہا جاتا تھا کہ جو کام نکتہ چینی نہ کر سکی وہ چینی نے کر دیا۔ لیکن یہ دورِ آمریت کی باتیں تھیں لیکن موجودہ حکومت نے عوام میں محنت کا شعور پیدا کیا ہے۔ اب وہ احتجاج کرنے کی بجائے مصائب کو حوصلہ مندی سے جھیلنے اور اپنی توانائی کا ہر ہر جوہر محنت میں صرف کرنے کا سلیقہ سیکھ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پیداوار بڑھی ہے، برآمدات میں اضافہ ہوا ہے، زرِ مبادلہ کے ذخائر کئی گنا بڑھ چکے ہیں ___ لیکن ابھی تک ہم خود کفالت کی منزل پر نہیں پہنچ پائے ہیں۔"

یہ وہ مخصوص جملے تھے جو ریڈیو مختلف انداز میں روزانہ دہراتا تھا اور اب

ان کے نزدیک یہ الفاظ بے معنی ہو چکے تھے اور ان پر مزاحیہ انداز میں یوں تبصرہ کیا کرتے تھے کہ پیداوار میں اضافے کا مطلب آبادی میں اضافہ ہے۔ برآمدات میں اضافے کا اشارہ یہ ہے کہ وزیروں، سفیروں اور اعلیٰ حکام کے بچوں، بھانجوں اور بھتیجوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے زیادہ تعداد میں باہر بھیجا جارہا ہے اور زرمبادلے میں اضافے کا مطلب یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کی بینکوں میں سربرآوردہ حضرات کے اکاؤنٹس بڑھتے جارہے ہیں۔

لیکن ان طنزیہ تبصروں نے کبھی احتجاجی مظاہروں اور جلوسوں کی شکل اختیار نہیں کی اور اس کا سبب تھا گرانی اور مصروفیت۔ گرانی کی بنا پر ہر شخص دوگنی تگنی محنت کرنے پر مجبور تھا۔ ہر شخص اوور ٹائم کرتا تھا۔ سرکاری ملازمین کو بھی گرانی کا مقابلہ کرنے کے لئے دفتری اوقات کے بعد جز وقتی ملازمتیں کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ہر شخص انسان کے بجائے کام کرنے کی مشین میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ بچت کی اسکیم کے تحت ہر گھرانے کو چولھا گرم کرنے کی ہر چیز روزانہ خریدنی پڑتی تھی۔ راشن کا کوٹا فی کس یومیہ تھا۔ مرد دن بھر روزگار میں مصروف رہتے اور بچوں اور عورتوں کی قطاریں صبح سے شام تک راشن کی دوکانوں پر لگی رہتیں۔ مصروفیت کے اس عالم میں احتجاج اور جلسے جلوسوں کی فرصت ہی کہاں تھی۔

اسی شام ریڈیو نے مقامی خبروں کے بلیٹن میں درآمد شدہ گھی کی تقسیم کے طریقے کار کی تفصیلات بھی بتائیں جس کے مطابق گھی کی تقسیم کے لئے شہر کو چار حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ہر حلقے میں تقسیم کا ایک اعلیٰ افسر اور معاون افسر مقرر کئے گئے تھے۔ گھی کی تقسیم کو قومی یک جہتی کی علامت بنانے کے لئے فیصلہ کیا گیا تھا کہ گھی کا کوٹا

راشن کی دوکانوں پر نہیں بلکہ سرکاری پارٹی کے حلقہ دفتروں پر ہوگا۔ اس فیصلے کا دوسرا سبب یہ تھا کہ راشن کی دوکانوں کے مقابلے میں ان حلقہ دفتروں کی تعداد زیادہ تھی۔

رات ہوئی تو لوگوں نے آتش بازی چھوڑ کر گھی کی درآمد کا جشن منایا۔ یہ آتش بازی پارٹی کے حلقہ دفتروں کی طرف سے گھر گھر تقسیم کی گئی تھی اور اس کا ذخیرہ ایک ہفتہ قبل حلقہ دفتروں میں کر لیا گیا تھا۔ آتش بازی کا حُسن دوبالا کرنے کے لئے تمام شہر کی بجلی بند کر دی گئی تھی۔ اس سے قبل ریڈیو نے اعلان کیا تھا کہ بجلی بند کرنے سے نہ صرف آتش بازی کا حُسن نکھرے گا بلکہ اس سے بجلی کی بچت بھی ہوگی۔ حکومت ان دونوں بچت کی اسکیم پر سختی سے عمل کر رہی تھی اور ویسے بھی یہ بچت کا ہفتہ تھا۔

بات یہ نہیں تھی کہ ملک میں گھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ملک میں گھی کے بڑے بڑے کارخانے تھے جو ملک کی ضروریات کے مطابق گھی تیار کر سکتے تھے۔ ان کارخانوں کو عوام کی بہبود اور انھیں صنعت کاروں کے استحصال سے نجات دلانے کے لئے قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ملک میں پیدا ہونے والے گھی میں ایسے طبّی اجزا شامل کر دیئے گئے تھے کہ عالمی ادارۂ صحت نے اس گھی کو انسانی صحت کے لئے انتہائی مفید قرار دیا تھا۔ یہ گھی اپنے عہد کا معجزہ تھا۔ اس کے استعمال سے انسان کے قویٰ مضبوط ہو جاتے تھے، توانائی بڑھ جاتی، جوانی دیر تک قایم رہتی، بڑھاپا دیر میں آتا۔ انسان بیماریوں سے۔

”میں گھی کی تقسیم کا اصول بتا رہا ہوں“ افسر تقسیم کی آواز ابھری۔ لوگ خاموش گوش بر آواز ہو گئے۔

"حکومت نے گھی کی تقسیم کے لیے جو اصول وضع کیا ہے وہ کفایت شعاری اور بچت کے فلسفے کے عین مطابق ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حکومت آپ سے کس قسم کی کفایت شعاری کی توقع رکھتی ہے۔"

لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے لئے قطار میں کھڑے ہوئے۔ لوگ آگے پیچھے مڑے۔ مسلح پولیس کے جوانوں نے بندوقیں سیدھی کر لیں ——
"آپ لوگ خاموش ہیں"۔ موٹے بدصورت پولیس کی آواز گونجی۔ اس کے مخاطب قطار میں کھڑے ہوئے لوگ تھے۔

بندوقوں کی نالیں اپنی طرف اٹھی دیکھ کر لوگ سہم گئے۔ افسر تقسیم نے کہا۔"آپ لوگوں کو صرف انگلی بھر گھی ملے گا —— اس کا طریقہ ——

لوگ بپھر گئے۔"انگلی بھر گھی ——" ان کے لہجے میں احتجاج تھا۔

بدصورت پولیس افسر نے پھر کہا۔"خاموش ——" پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔"جوانو! اب اگر کوئی آواز اٹھے تو میں صرف ایک —— دو —— تین کہوں گا۔ —— اس وقت تک یہ لوگ خاموش نہ ہوں تو بے دریغ گولی چلا دینا ——

سہمے ہوئے لوگ ساکت ہو گئے۔ افسر تقسیم کی آواز پھر بلند ہوئی۔"گھی کی تقسیم کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس سرخ ڈبے میں جو گھی سے لبالب ہے ——

لوگوں نے ایڑیاں اٹھا کر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر گردنیں نکال کر اور لمبی کر کے اس ڈبے کو دیکھا جو انھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ دکھائی دیا۔ یہ ڈبہ ایک برف کی سل پر رکھا ہوا تھا۔

"ہاں —— یہ ڈبہ گھی سے لبالب بھرا ہوا ہے ——

"دکھاؤ انھیں ـــــ" اس نے عملے کے دو ارکان سے کہا۔ انھوں نے ڈبے کو ٹیڑھا کر کے دکھایا۔ ڈبہ واقعی گھی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ شدید گرمی میں گھی کو جمائے رکھنے کے لئے برف کی سل نیچے رکھی ہوئی تھی۔

"دیکھ لیا آپ نے ـــــ؟ طریقہ کار یہ ہوگا ـــــ" افسرِ تقسیم نے کہا۔ وہ صورت حال کو ڈرامائی بنانا چاہتا تھا۔ کارڈ میں کوٹے کا اندراج کرانے کے بعد آپ شہادت کی انگلی گھی میں داخل کریں گے اور باہر کھینچ لیں گے۔ جو گھی انگلی پر چمٹ آئے گا وہی آپ کا کوٹا ہوگا۔ فی کارڈ ایک انگلی بھر گھی۔"

لوگ مایوس ہو گئے، اور قطار چھوڑ کر جانے لگے۔

سرکاری پارٹی کے حلقہ دفاتر پر گھی لینے والوں کی طویل قطاریں لگ چکی تھیں۔ ہر دفتر پر مسلح پولیس کے دستے موجود تھے، لوگوں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ اور وہ بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ پولیس افسر لاؤڈ اسپیکر پر بار بار لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کر رہا تھا۔

سورج کو بھی اسی دن پوری شدت سے چمکنا تھا۔ سمندری ہوا کے نرم و لطیف بھیگے ہوئے جھکڑوں کو بھی بند ہونا تھا۔ لوگ دھوپ میں کھڑے رہے۔ پسینہ سر سے ایڑیوں تک بہہ رہا تھا۔ جوں جوں دیر ہو رہی تھی لوگوں میں بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر لوگوں میں احتجاجی جملوں کی لہر دوڑی۔ اسی لمحہ لاؤڈ اسپیکر سے لوگوں کو اطلاع دی گئی اور وائرلیس پر موصول ہونے والے پیغام کے مطابق گھی کی گاڑی سرکاری ڈپو سے چل پڑی ہے۔

اس اطلاع پر لوگوں کا اضطراب کچھ کم ہوا۔

خدا خدا کر کے گھی کی گاڑی وہاں پہنچی۔ ساتھ ہی افسر تقسیم بھی اور گاڑی کے ساتھ مسلح گارد بھی تھی۔ افسر تقسیم اپنی بکتر بند گاڑی سے اترا اور سینہ تانے بڑی تیزی سے دفتر میں داخل ہوا اور مائک سنبھال لیا۔ آواز گونجی:

"میں آپ کے ہاتھوں میں ڈبے، دیگچیاں اور برتن دیکھ رہا ہوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ابھی اپنے تاریک ماضی سے چمٹے ہوئے ہیں۔ نئے دَور کے تقاضوں کا آپ کو علم نہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے ......"

افسر تقسیم کا لہجہ تند اور سخت ہوتا جا رہا تھا:

"اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ابھی تک بچت اور کفایت شعاری کی روح اور مفہوم سے واقف نہیں ہو سکے ہیں ـــــ"

"ہمیں تقریر نہیں ـــــ گھی چاہیئے۔"

"گھی ـــــ چاہیئے ـــــ گھی دو ـــــ" دوسری طرف سے نعرہ اُبھرا۔

"بکواس بند کرو ـــــ" مائک پر افسر تقسیم کی آواز گونجی "بچت کی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے حکومت نے کروڑوں روپے سے جو مہم شروع کی ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ آپ اسراف بیجا پر اتر آئیں۔"

"گھی دو ـــــ گھی دو ـــــ" تان میں نعرہ لگاتا۔

محفوظ ہو جاتا اور عمر طویل ہو جاتی لیکن طبی اجزا کی آمیزش کے بعد گھی کی لاگت بے پناہ بڑھ گئی تھی اور یہ گھی غریب ملک کے مفلوک الحال عوام کی دسترس سے باہر ہو گیا تھا۔ چنانچہ حکومت نے عوام کے فائدے کے لئے نہایت دور رس

فیصلہ کیا۔ ان کو خوش حالی اور مسرتوں سے ہمکنار کرنے کے لئے پانچ برس تک کی مدت کے لئے اس معجزاتی گھی کے دوسرے ممالک سے سودے کرتے تھے۔

گھی کی برآمد کے فیصلے کے ساتھ سرکاری اعلان میں کہا گیا تھا:

"ہم عیاشیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ٹھیک ہے کہ صحت بخش گھی کا فارمولا ملک کے ذہین سائنس دانوں نے تیار کیا ہے لیکن ہم اس قومی دولت کو صرف یہ ثابت کرنے کے لئے ضائع نہیں کر سکتے کہ ہم چٹورے خوش خوراک اور مسرف ہیں۔ ہم اس گھی کو برآمد کریں گے جس سے ملک کو قیمتی زرمبادلہ حاصل ہو گا۔ ہم بیماریاں قبول کر لیں گے مگر گھی نہیں کھائیں گے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اس نعمت سے متمتع ہو سکیں۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم وہ قوم ہیں جو ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار ہے۔ ہمیں آنے والی نسلوں کے لئے قربانی دینی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ قربانی کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ حکومت کو امید ہے کہ ہر شخص حکومت کے اس فیصلے کی حمایت کرے گا کہ حب وطن کا تقاضا یہی ہے۔"

اسی دن ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے وزیر صحت و خاندانی منصوبہ بندی نے کہا تھا:

"صحت افزا گھی کی برآمد کا فیصلہ بڑا صحیح اور دانش مندانہ ہے۔ ہمارے ملک میں شرح پیدائش پہلے ہی بہت زیادہ اور شرح اموات کم۔ پھر ہم ایک غریب قوم ہیں اس مرحلے پر یہ گھی ہمارے عوام کے استعمال میں آیا تو شرح پیدائش اور شرح اموات میں یہ فرق اور بڑھ جائے گا اور سات آٹھ سال بعد آبادی میں اتنا اور ایسا اضافہ...... ہو گا کہ لوگ زندہ انسانوں کو کھانے لگیں گے۔

والدین اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنے ہی بچوں کو کھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس گھی سے خوراک دگنی تگنی ہو جاتی ہے اور بھوک بھی بہت لگتی ہے۔ لہٰذا حکومت مستقبل میں سامنے نظر آنے والے اس بحران کو دعوت نہیں دے سکتی۔

اگلے دن بڑے بوڑھے اور بچے صبح تڑکے ہی اٹھ بیٹھے۔ کڑوی کسیلی چائے پی اور سرکاری پارٹی کے حلقہ دفتروں کی طرف چل پڑے۔ کڑوی کسیلی چائے پینے پر وہ اس لئے مجبور تھے کہ چینی میں بھی صحت افزا اجزا شامل کر کے اسے برآمدی فہرست میں شامل کر دیا گیا تھا۔ یوں گھی کی طرح چینی بھی ملک کی معاشی صحت کے لئے مضر قرار دے دی گئی تھی۔

"کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ہر شخص اپنی جگہ قطار میں آجائے۔ افسر تقسیم نے تلخ لہجے میں کہا۔

"ہمیں نہیں چاہیے گھی"

"لے جاؤ اپنے گھر"

"اپنی ماں ــــــ"

احتجاجی جملے ابھرے۔

"پولیس ــــــ" افسر تقسیم نے کہا۔ مسلح پولیس کے جوان مستعد ہو گئے۔ لوگوں کے بڑھتے ہوئے قدم رکے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ــــــ

"اپنی اپنی جگہ واپس ــــــ" افسر تقسیم کا لہجہ بلند تھا۔

تنی ہوئی بندوقوں کو دیکھ کر لوگ پھر قطار میں آگئے۔

افسر تقسیم نے کہا "حکومت ہر شخص کو اس کا حصہ پہنچانے کی ذمہ دار ہے۔
کوئی شخص گھی کے کوٹے سے محروم نہیں رہ سکتا۔"

اور گھی کی تقسیم شروع ہو گئی۔

کلّو کی انگلیاں بچپن سے ٹیڑھی تھیں۔ وہ ٹیڑھا پن لے کر ہی پیدا ہوا تھا۔
گھی کی تقسیم جاری تھی۔ اس کا نمبر ۲۵ واں تھا۔

اس نے اپنی ٹیڑھی انگلی گھی میں ڈالی اور جب اس کی انگلی باہر آئی تو ٹیڑھی
انگلی کے آنکڑے میں چمچہ بھر گھی پھنسا ہوا تھا۔

کلّو سرکاری پارٹی کا سرگرم رکن تھا۔ اس کی ٹیڑھی انگلی میں چمچہ بھر گھی دیکھ کر،
جسے اس نے بڑی احتیاط سے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر منتقل کر لیا تھا۔ لوگ مشتعل ہو گئے۔

"یہ نا انصافی ہے۔"

"یہ ظلم ہے۔"

"ہم بھی اتنا ہی گھی لیں گے ــــــ" کئی آوازیں اُبھریں۔

"ایک ــــــ دو ــــــ" موٹے اور بدصورت پولیس افسر نے گنتی شروع کی۔
پولیس کے جوانوں کی ایڑیاں بجیں۔ انھوں نے انسانی ہدفوں کی بندوقیں اٹھا لیں۔

افسر تقسیم نے کہا "گھی کی تقسیم قانون کے عین مطابق کی جا رہی ہے۔" اس نے
گھی کے ڈبے میں انگلی ڈالنے سے متعلق حکومت کی تصویری ہدایات لوگوں کو دکھائیں۔
اور پھر کلّو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کی شہادت کی انگلی کا ٹیڑھا پن قدرتی
ہے۔ اس سے گھی لینا اس کا قانونی حق ہے۔"

"ہم بھی انگلی ٹیڑھی کریں گے۔" ایک جوشیلے نوجوان نے کہا۔

"یہ بغاوت ہے ـــــــ قانون شکنی ہے۔" افسر تقسیم نے کہا۔

"قانون شکنی تم کر رہے ہو۔" کئی آوازیں گونجیں۔

برسوں کی محرومیوں پر لگا ہوا خوف کا بند ٹوٹ گیا۔ قطار ٹوٹی۔ ہجوم آگے بڑھا۔

تین دن تک گنتی پوری ہو گئی۔

گولیاں چلیں۔ کئی افراد زمین پر گرے۔ سڑک کے سیہ گرم سینے پر خون بہتا رہا۔

کچھ مٹی میں جذب ہوا، چیخیں ابھریں، کراہیں ابھریں، سسکتی ہوئی زندگیاں دم توڑ گئیں۔

لوگ پسپا ہو گئے۔ زخمیوں اور لاشوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔

گھی کا ڈبہ بھیڑوں کے متروکہ خشک چھتے کی مانند پڑا رہا۔

تین دن کے لئے علاقے میں کرفیو لگ گیا۔

اسی شام گھی کی تقسیم کے طریقہ کار سے متعلق ترمیمی آرڈی ننس جاری ہوا جس کے تحت شہادت کی تمام ٹیڑھی انگلیوں کو قلم کر دینا تھا۔

ترمیمی آرڈی ننس کی اس شق کی تکمیل کے لئے پورے ملک میں کرفیو لگا دیا گیا۔ قصائیوں۔ جراحوں اور ڈاکٹروں کی ٹیموں نے تین دن کے اندر شہادت کی وہ تمام انگلیاں قلم کر دیں جو ٹیڑھی تھیں۔

لیکن آنے والی نسل تمام کی تمام انگلیاں ٹیڑھی لے کر پیدا ہوئی۔

خالدہ اصغر

سواری

سورج ڈوب رہا تھا اور مجھے شہر پہنچنے کی جلدی تھی۔ کچا راستہ عبور کر کے میں پُل پر ہو لیا ـــــ دور ـــــ راوی کی مٹی میں سورج اتر رہا تھا۔ بس اب جلتے تانبے سا کنارا رہ گیا تھا۔ میں نے بے دھیانی میں اس کنارے کو دیکھا اور پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ مگر کچھ دور جا کے مجھے خیال سا ہوا کہ میں نے کچھ دیکھا اس لیے میں مڑا اور میں نے پل کے جنگلے پر جھکے وہ تینوں شخص دیکھے۔ وہ تینوں سامنے دریا کی دلدل میں اترتے سورج کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی سورج کی جانب دیکھا مگر کچھ نہ پا کر پھر ان تینوں کے چہروں کی طرف نگاہ پھیری۔ ان تینوں کی شکلیں مختلف تھیں جیسے ہم سب کی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر پھر بھی یوں لگتا تھا۔ جیسے ایک ہی شخص تین بن کر کھڑا ہو۔ ان کے کپڑے اونچے طبقے کے دیہاتیوں کے سے تھے اور جوتوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں جیسے وہ میلوں کا سفر کر کے یہاں پہنچے ہوں۔ اسی لمحے کی خاطر ـــــ

سوکھتے راوی کی دلدل میں اُترتے سورج کو دیکھنے۔ اور اب وہ گہرے انہماک سے، سڑک پر آتی جاتی بھاری ہلکی سواریوں اور انسانوں سے بے خبر اس سُرخ ہوتی دلدل پر نگاہیں جمائے تھے۔ میں بھی پل بھر کو ان کے قریب رُک گیا۔

اب سورج چھپ چکا تھا اور زمین سے ملتے آسمان پر گہری سرخی پھیلی تھی۔ یکدم ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف خاموش نگاہوں سے دیکھا اور پھر ان کے سر جھک گئے۔ پھر خاموش ہی وہ شہر کی دوسری سمت مضافات کو لوٹ گئے۔ میں کچھ دیر کھڑا انھیں مضمحل قدموں سے لوٹتا دیکھتا رہا۔ پھر مجھے شہر میں جاگتی راتوں کی آوازوں نے چونکایا۔ اب پھیلتی رات کے نیلے دھوئیں میں بتیاں ٹمٹمانے لگی تھیں اور مجھے یاد آیا کہ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی ہے۔ چنانچہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

اگلے روز جب میں سوکھتے راوی کے پُل سے گزرا تو بھی سورج ڈوبنے میں کچھ دیر تھی۔ سورج کو دیکھ کر مجھے ان تینوں کا خیال آگیا اور میں بغیر ارادے کے جنگلے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے خیال بھی آیا کہ جلدی گھر پہنچنا ہے۔ مُنّا ڈیوڑھی میں کھڑا ریوڑیوں کا انتظار کر رہا ہو گا اور زکیہ سینما کے لئے تیار ہو گی۔ پھر بھی لمحہ بھر کو وہاں رُک گیا۔ غروب کا وقت قریب ہی تھا۔ اگلے دن مجھے رات بھر یہی خیال ستاتا رہا کہ وہاں دریا کی دلدل اور سورج کے تانبے میں کیا تھا کہ وہ تینوں اس انہماک سے اسے دیکھتے تھے۔

اب روشنی مدھم پڑ رہی تھی اور سورج کا نارنجی دمکتا تھال زمین کی طرف اُتر رہا تھا۔ مگر عین غروب کے وقت دیہات کی سمت سے تین شخص آتے دکھائی

دیے ۔ ایک سے قد، ایک سی چال اور لباس ۔ جب قریب پہنچے تو وہی اگلے دن والے شخص تھے ۔ وہ پھر چپ چاپ آکر جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے اور اسی انہماک سے ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے ۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تینوں کی آنکھیں کوئلے کی طرح دہکتی تھیں اور ان کوئلے کی طرح دہکتی آنکھوں میں ایک سی اُداس چپ بھری تھی ۔ اب پھر مجھے حیرت ہوئی کہ مختلف خدوخال رکھنے کے باوجود یہ تینوں ایک سے کیوں لگتے ہیں ۔ ان میں سے ایک شخص خاصا معمر تھا اور اس کا چہرہ گھنی سفید داڑھی میں چھپا تھا ۔ دوسرے کا رنگ اپنے دونوں ساتھیوں کی نسبت صاف تھا اور ڈوبتے سورج کی سُرخ روشنی میں کندن کی طرح دمکتا تھا ۔ اس کے بال جھالر کی صورت گردن پر پڑے تھے اور ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا ۔ تیسرا پہلے دونوں کی نسبت سیاہ فام تھا اور بے حد چپٹی ناک رکھتا تھا ۔ میں انھیں غور سے دیکھتا رہا اور اسی اثنا میں سورج ڈوب گیا ۔ پھر ان تینوں نے پہلے کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سر جھکا لیا اور پھر اپنے راستے پر لوٹ گئے ۔

اس رات میرا جی کسی کام میں نہ لگا اور میں پچھتایا کہ آخر میں نے ان سے پوچھا کیوں نہ کہ وہ سوکھتے راوی کی دلدل میں اترتے سورج میں کیا ڈھونڈنے آتے ہیں ۔ میں نے ذکیہ سے ان تینوں کا تذکرہ کیا ۔ مگر ذکیہ ہنس کر خاموش ہو رہی ۔ "یوں ہی کوئی دیہاتی شہر کی سیر کو آئے ہوں گے ۔"

میں نے سوچا کہ ذکیہ غلط بھی نہیں کہتی ۔ جب تک کوئی ان تینوں کو دیکھے نہیں ان کے اسرار کا احساس نہیں کر سکتا ۔ اگلے روز تمام دن مجھے شام کا انتظار

رہا۔ غروبِ آفتاب کے وقت میں جنگلے پر کھڑا ان کی راہ دیکھنے لگا۔ عین روشنی کے ڈھلتے وہ تینوں ایک سی چال چلتے جنگلے پر آن رکے اور آتی جاتی سواریوں اور انسانوں کے شور سے بے خبر ڈوبتے سورج کو دیکھنے لگے۔ دیکھنے کے عمل میں وہ یوں محو ہوتے تھے کہ اس کے درمیان ان سے بات کرنا ناممکن لگتا تھا۔ چنانچہ میں سورج کے پوری طرح ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا اور سوچا کہ جب یہ تینوں اپنے راستے پر مڑیں گے تب میں ان کا پیچھا کروں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ تم کون ہو اور ڈوبتے سورج اور سوکھتے دریا کی دلدل اور شام کے لمحے میں کیا ڈھونڈتے ہو؟

جب سورج پورے کا پورا ڈوب گیا تو ان تینوں نے پھر گنگ اداسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیے۔ اور میں اس بات کا منتظر ہوا کہ اب یہ اپنی راہ لیں اور میں ان کے پیچھے ہو لوں۔ مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ واپس اپنی راہ پر لوٹنے کی بجائے وہ سڑک پر ہو لیے۔ ان کی جوتیوں پر گرد کی تہیں جمی تھیں اور ان کے قدم ساتھ ساتھ اٹھتے تھے۔

آخر میں ہمت کر کے ان سے مخاطب ہوا اور میں نے پوچھا:

"بھائیو! تم کس گاؤں سے آئے ہو؟"

چپٹی ناک والے نے گھوم کر مجھے دیکھا اور پھر وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"وہاں پل پر کیا دیکھتے ہو؟" اب ان کے اصرار سے میرا جی بوجھل ہو رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے میری ٹانگوں میں ——— سارے جسم میں پگھلا سیسہ اتر رہا ہے اور میں ابھی چکرا کے گر کر ڈھیر ہو جاؤں گا۔ وہ تینوں میرے اس سوال پر بھی

نقشِ دیوار کی مانند خاموش رہے۔ اب کے میں نے چلّا کر ان سے بات کی اور میری آواز بھرا گئی اور آنکھیں جلتے پانی سے بھیگ گئیں۔

"اس سورج کو کیوں دیکھتے ہو؟" میں نے ان کے قدم کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کی کیونکہ اب وہ نہایت تیزی سے چلنے لگے تھے۔ وہ تینوں میرے اس سوال پر بھی خاموش رہے۔ اب شہر کی سڑک قریب تھی اور سواریوں کی ریل پیل تھی۔ مصروف رات کی آوازیں بہت قریب آگئی تھیں اور ہوا میں جاتے اکتوبر کی خنکی تھی۔ کہیں سے چنبیلی کی مہک لہر بن کر آئی تھی اور ہم محصول چنگی کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اچانک معمّر شخص نے، جس کے بال برف کی طرح سفید پڑ چکے تھے، کہا:

"کیا تم نے نہیں دیکھا؟ کیا اس شہر کے کسی شخص نے دیکھا؟"

"کیا؟ کیا نہیں دیکھا؟"

"جب سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکتا ہے!" معمّر شخص نے چادر کی بُکل ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"سورج ڈوبتا ہے اور ڈوب چکتا ہے! وہ تو ہم روز ہی دیکھتے ہیں۔ بلکہ نہیں دیکھتے کیونکہ سورج روز ہی ڈوبتا ہے،" میں نے تیزی سے کہا کہ مبادا وہ شخص پھر خاموش ہو جائے۔

"ہم جانتے تھے کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسی لئے ہم آئے ہیں۔ یہ پچھلی بستی بھی!" معمّر شخص نے مشرق کی طرف اشارہ کیا۔ اور سر جھکا کے خاموش ہو گیا۔

"ہاں، جہاں سے ہم آئے ہیں ـــــ" چپٹی ناک والے نے کہا۔

"کہاں سے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔"

اس پر درمیان کے شخص نے میری طرف مڑ کے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان پہلے بھی گہرا نظر آ رہا تھا۔

"ہم نے بھی نہیں دیکھا تھا اور تم نے بھی نہیں دیکھا۔ کیونکہ سورج روز چڑھتا ڈوبتا ہے اس لیے ہم نہیں دیکھتے۔ اسی لیے جب ادھر (اس نے ہاتھ سے مشرق کی طرف اشارہ کیا) سورج ڈوبنے پر سرخی لہو کی طرح گہری ہونے لگی اور رات کے اندھیرے میں بھی اتنی گہری آگ کی طرح دہکتی رہنے لگی تو ہمیں خبر تک نہ ہوئی اور پھر ——" وہ اچانک خاموش ہو گیا جیسے اس کا گلا رندھ گیا ہو۔

"یہ سرخی بستی بستی پھیلتی ہے۔ ایسی سرخی میں نے کبھی اپنی زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ نہ ہی میرے بزرگوں نے اور نہ ہی ان کے بزرگوں نے کبھی اپنے بزرگوں سے کوئی ایسی بات سنی تھی۔ اس سے پہلے کا پتہ نہیں۔"

اس پر میں نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دریا پر پھیلتے آسمان کو دیکھا۔ اندھیرا خوب سا گہرا ہو چکا تھا اور سڑکوں کی زرد بتیاں ٹمٹماتی تھیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی صورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں سوائے ان کے سفید سفید کپڑوں یا پھر ان کے دھندلے چہروں کے جب وہ کسی بجلی کے کھمبے تلے گزرتے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا کہ اس اندھیرے میں بھی آسمان کا وہ ٹکڑا آگ کی طرح دہکتا تھا۔

"ہاں واقعی —— ہم نے نہیں دیکھا۔" میں نے حیرانی چھپانے کی کوشش کی۔

"اب تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

"ہم یوں ہی شہر کو جا رہے ہیں۔ بعد میں آنے کا کیا فائدہ؟"
میرا جی چاہا ان لوگوں کے ساتھ رہوں۔ انھیں اپنے گھر لے چلوں۔ مگر وہ اچانک ہی دوسری سڑک پر مڑ گئے اور مجھے یاد آگیا کہ مجھے جلدی گھر پہنچنا تھا۔ منا ڈیوڑھی میں ریوڑیوں کے انتظار میں کھڑا ہو گا۔ اور ذکیہ انتظار کرتے کرتے بیزار ہو چکی ہو گی۔

اس سے اگلے روز میں سوکھتے راوی پر ڈکا اور سورج کو ڈوبتے دیکھتا رہا۔ پورے کا پورا سورج چھپ گیا مگر ان تینوں کا آج کوئی پتا نہ تھا۔ پہلے میں بے چینی سے ان کا منتظر رہا۔ مگر پھر ڈوبتے سورج کی سرخی میں محو ہو گیا۔ آسمان پر گویا لہو کی چادر تنی تھی۔ پھر اچانک اس لہو کی چادر کے سامنے تنہا کھڑے کھڑے مجھے خوف آنے لگا۔ اپنے پیچھے —— بالکل پیچھے —— شانوں کی ہڈیوں کے درمیان مجھے کسی کے وجود کا احساس ہوا۔ کوئی میرے پیچھے کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا کوئی نہ تھا —— مگر غلط ہے —— میں نے پیچھے دیکھا ہی کب ہے، میں اپنے پیچھے کیسے دیکھ سکتا ہوں۔ نہیں دیکھ سکتا اور میرے پیچھے کوئی موجود ہے۔ میرے اندر یا شاید مجھ سے الگ۔

سواریاں اپنے راستے پر چلی جاتی تھیں۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ شام گہری ہو چکی تھی اور پھیلتی رات میں آسمان کا وہ ٹکڑا لہو کی چادر بنا دمکتا تھا اور اس کی آنچ دور دور کے اندھیروں تک پہنچتی تھی۔ خوف زدہ ہو کر میں گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچتے ہی میں نے ذکیہ سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا۔ وہ میرے وہم پر ہنس دی۔ مگر میں اسے چھت پر لے گیا۔ رات کی تاریکی میں بھی وہ سرخی

چمک رہی تھی۔ ذکیہ کچھ خاموش سی ہو گئی، پھر بولی:

"کوئی آندھی آتی ہو گی"۔

اگلے روز میں دفتر میں فائل پر جھکا تھا کہ مجیب اللہ نے حفیظ احمد سے کہا:

"یار آج کل سورج چھپنے پر دیکھا ہے آسمان کیسا سُرخ ہوتا ہے۔ اندھیرے میں بھی باقاعدہ سُرخ رہتا ہے"۔

اس پر مجھے یوں لگا جیسے میں اکیلا اس چادر رِخوں کے سامنے کھڑا ہوں اور مارے خوف کے میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور شام قریب آتی گئی میرے دل میں عجیب دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ میں سوکھتے راوی اور پل اور آسمان اور سورج سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ ان کا خوف میرے اندر پھیل رہا تھا۔ خوف کے ساتھ ساتھ آسمان کے لہو اور زمین کی دلدل اور تینوں شخصوں کی کشش بھی مجھے کھینچ رہی تھی۔ میں نے سوچا میں اپنے ساتھیوں سے ان تینوں دیہاتیوں کا تذکرہ کروں کہ اس لہو رنگ شام کی آمد کے ساتھ ساتھ تین دیہاتی بھی، جو مختلف صورتوں کے باوصف ایک سے تھے، اس شہر میں اترے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے مجھے یہ سُرخی دکھائی تھی اور دکھا کر خود ایک سڑک پر گھوم گئے اور شہر کی بھیڑ میں گُم ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ بھی بستی اس لہو رنگ شام کے ساتھ ساتھ گھومتے ہیں۔ میں نے انھیں شہر میں بہت ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام و نشان نہیں۔

مگر مجیب اللہ اور حفیظ احمد دونوں مجھ سے بات کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ عرصہ ہوا ان دونوں نے مجھ سے دس بیس روپے قرض لیے تھے۔ جو نہیں لوٹائے

تھے اور اب وہ مجھ سے پرخاش رکھتے تھے۔

چنانچہ میں خاموش رہا اور گھر لوٹتے ہوئے جب پُل پر پہنچا تو میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور ڈوبتے سورج کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور شہر کی سڑک کو بغور دیکھتا رہا۔ مگر پھر بھی وہ لہو رنگ شام میرے ساتھ ساتھ چلتی ——— آگے پیچھے پھیلتی ——— سانس لیتی جُھکتی چلی آتی تھی۔ میرے سامنے پھیلے شام کے پھیکے اندھیرے میں کجلائے آسمان پر سیاہ پرندوں کی ٹولیاں آٹھ کے ہندسے کی شکل میں اُڑتی جاتی تھیں۔ ان کی طرح میں بھی اپنے ٹھکانے کو لوٹ رہا تھا ——— ٹھکانا کہ جو اب محفوظ نہ رہا تھا کیوں کہ لہو رنگ شام اس کی کھڑکیوں، دروازوں میں سے بہہ بہہ کر اسے اپنے آپ سے بھر رہی تھی۔

اب میں رات گئے تک شہر میں گھومتا۔ ہر قسم کی دُکان میں جھانکتا کہ شاید کہیں وہ گرد آلود جوتیوں اور سفید چادروں کی بکلوں میں چھپے دیہاتی نظر آجائیں اور میں ان سے پوچھ پاؤں کہ یہ سرخی کہاں سے آتی ہے اور اس کے آنے کے بعد کیا آتا ہے؟ تم پہلی بستی کیوں چھوڑ آئے۔ اور اب وہ کس حال میں ہے؟ مگر مصروف تیز رفتار کلبل کلبل کرتے شہر میں کہیں ان کا نام و نشان نہ تھا۔ اور اہلِ شہر تجارت میں کمال منہمک تھے۔

مگر کچھ ہی دنوں میں شہر میں شام کے وقت میں نے کچھ آدمیوں کو مغرب پر پھیلتی سرخی کی طرف اشارہ کرتے دیکھا۔ معلوم نہیں یہ سرخی کی اطلاع چند ہی دن میں کیوں کر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ میں نے تو سوائے ذکیہ کے اور کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ پھر سب نے اس خونچکاں آسمان کو

کیوں کر دیکھ لیا ؟ اس پر مجھے خیال آیا کہ وہ دیہاتی یقیناً شہروں میں موجود ہیں۔

اب ہر جگہ اس سرخی کے چرچے تھے۔ چودھری صاحب میرے پرانے واقف کاروں میں سے ہیں اور مزنگ کے چوک میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ شام گئے ان کے یہاں دوست احباب کی صحبت رہا کرتی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے میں نے وہاں جانا ترک کر رکھا تھا۔ کچھ دنوں سے مراد یہی کہ جب سے وہ تینوں شخص مجھے ملے تھے اور اب تینوں کے غائب ہو جانے پر ایک عجیب اضطراب مجھ پر حاوی ہوا تھا۔ کیا گھر اور کیا باہر —— گھر میں میرا جی چاہتا باہر جاؤں اور باہر آکر سوچتا نہیں گھر زیادہ محفوظ تھا۔ پھر میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر پاتا کہ مجھے کہاں ہونا چاہیئے اور ایک بوجھل پن میرے جی پر آن پڑتا۔

اس شام میں یونہی، پرانے وقتوں کی طرح، چودھری صاحب کی دکان پر جا نکلا۔ کچھ پرانے کچھ نئے لوگ جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی چودھری صاحب بولے:

"کیوں بھائی، تمھارا کیا خیال ہے؟ کہتے ہیں یہ سب ایٹمی تجربات کا اثر ہے۔ سنا ہے اب دنیا کے سرد حصے گرم اور گرم سرد ہو جائیں گے۔ رُتوں کا سلسلہ بھی بدل جائے گا۔" !

اس وقت میں نے پھر سوچا کہ ان تین دیہاتیوں کی واردات ان کو سناؤں، مگر اتنے ہجوم میں بات کرنے کو میرا جی نہ چاہا اور میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ کر اخبار دیکھنے ہی لگا تھا کہ اس شوم گھڑی کا نزول ہوا۔

اچانک ایک تیز، ناخوشگوار سی مہک میں نے کبھی آج تک نہ سونگھی تھی۔ اس مہک کے آتے ہی میرا دل اندر ہی اندر ڈھینے لگا۔ اور معلوم نہیں جسم

کے کسی حصے میں بڑا گہرا مگر میٹھا میٹھا سا درد اٹھا۔ دراصل میں آخری وقت تک فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ مہک تھی یا درد۔ اس کی ناخوشگواری سے گھبرا کر میں نے اخبار میز پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔ سب نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

"کیا بات ہے، کہاں چل دیئے؟" چودھری صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں یہ کیسی مہک ہے۔" میں نے گہری گہری سانسیں لے کر کہا۔

"مہک ــــ مہک کیسی؟" چودھری صاحب نے ہوا میں سونگھ کر کہا۔

اور میں ان سے بات کئے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ رستہ بھر اس عجیب و غریب ناخوشگوار درد اور دہشت بھری مہک کی لہریں آتی جاتی رہیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں چکرا کر گر جاؤں گا اور چکرا کر گرنے سے پہلے کے نیلے نیلے اندھیرے میری آنکھوں میں گھومتے رہے۔ جب میں گھر پہنچا تو ذکیہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی۔

"کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا، چہرے پر کیسی زردی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک معلوم نہیں کیسی ہے۔"

میں نے ماتھے کا پسینہ پونچھا حالانکہ وہ نومبر کا مہینہ تھا۔

ذکیہ نے ہوا میں سونگھ کر کہا: "یہ پڑوس میں جانے دن رات کیا معجون بنتے رہتے ہیں حکیم صاحب کے یہاں اسی کی بو ہے اور پھر آج ہنڈیا بھی لگ گئی تھی۔"

"مگر یہ تو ہر جگہ ہے ــــ ہر سڑک پر ــــ تمام شہر میں۔"

"موسم جو بدلا ہے۔ سردی کے پھول پتوں کی مہک ہو گی۔"

ذکیہ نے بے دھیانی سے کہا اور سلائی پر اون کے خانے ڈالنے لگی۔

پھر میں نے ڈرتے ڈرتے ہوا میں سونگھا تو یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ مہک باقی ہے یا نہیں۔ شاید وہ ختم ہو چکی ہو گی۔ اس کے ختم ہونے پر مجھے بے حد خوشی ہوئی مگر پھر بھی اس کی یاد میرے اندر باقی تھی جیسے چوٹ کے بعد سوزش رہ جائے، اور اس خیال سے مجھے کپکپی آ گئی کہ شاید وہ مہک لوٹ آئے۔ مگر دفتر کے کام کاج میں اس حادثے کو بھول گیا۔ آج میرے سامنے فائلوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مجیب اللہ اور حفیظ احمد بڑے زور شور سے کسی فلم پر بحث کر رہے تھے اور کاغذات کا مفہوم میرے ذہن سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ تنگ آ کر میں نے گھنٹی کا بٹن دبایا اور چپراسی کو ہاف سیٹ چائے کا آرڈر دیا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی مگر عین اُسی وقت مجھے ایک شدید جھٹکا لگا جیسے میں کسی بے انتہا اونچان سے گر گیا ہوں۔ ایک تیز چکر کے ساتھ نیلے پیلے اندھیرے میرے گرد گھوم رہے تھے۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ در اصل وہ درد اور دہشت بھری مہک پھر لہر در لہر کہیں سے آ رہی ہے۔ میں نے دیوانہ وار کھڑکیاں بند کرنا شروع کیا۔ مجیب اللہ اور حفیظ احمد نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

"بھئی، دھوپ آنے دو۔ بند کیوں کرتے ہو؟ حفیظ احمد نے اپنے مخصوص بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

"یہ مہک ——— تمہیں نہیں آ رہی کیا ——— کس قدر ناقابلِ برداشت ہے۔"

مجیب اللہ اور حفیظ احمد نے ہوا میں ناک اونچی کر کے سونگھا اور پھر

حفیظ احمد نے قدرے تامل سے کہا:

"ہاں یار —— یہ کیسی بُو ہے یا شاید خوشبو۔ اس سے تو دل خراب ہونے لگتا ہے۔"

اس روز میں نے شہر میں کچھ اور لوگوں کو بھی اس مہک کا تذکرہ کرتے سنا جس کی لہریں کی لہریں آتی تھیں اور پھر تھم جاتی تھیں، پھر آتی تھیں اور تھم جاتی تھیں۔ مگر شام کو غروب آفتاب کے وقت ان میں تیزی اور شدت آتی جاتی۔ یہاں تک کہ چند ہفتوں میں اس مہک یا بُو کا یہ عالم ہو گیا کہ اکثر مجھے سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ اب اس شہر کے دمکتے چہرے ان لہروں پر ایک دم زرد پڑ جاتے۔ اکثر لوگوں کو گرانی اور خفقان کا آزار رہنے لگا اور ڈاکٹروں کا کاروبار خوب چمکا۔ دانشوروں کا کہنا تھا کہ ایٹمی تجربات سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اثرات ہو رہے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مہک بھی انہی تجربات کا اثر ہے اور اسی باعث لوگوں کے اعصاب کی حالت نازک ہو گئی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دکانوں سے اعصابی تھکن دور کرنے کی دوائیں ختم ہونا شروع ہوئیں۔ یہ بھی نہ تھا کہ دوائیں کم مقدار میں آتی ہوں مگر اہل شہر میں اس دوا کی ذخیرہ اندوزی کا عجب جنون پھیلا تھا کہ چند ہی دن میں نیند کی گولیاں بھی گوہر نایاب ہو گئیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے دونوں دواؤں کو بے سود پایا۔ درد و دہشت بھری مہک کی وہ لہریں اپنی کاٹ میں تلوار سے زیادہ تیز تھیں اور آدمی کے اندر اتر جاتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ لوگوں کے سامنے یہ

تجویز پیش کروں کہ اس تلوار کی کاٹ کاٹتی مہک سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس سے مانوس ہو جائیے، اسے اپنا شامہ جانیئے۔ دواؤں سے کوئی فرق نہ پڑے گا مگر ایک عجیب بے دلی کے ہاتھوں میں خاموش رہا۔ گو کچھ عرصے بعد ہی خود بخود یہی طریق کار سب نے اختیار کیا۔

اس مہک نے شہر میں دہشت کو عام کر دیا تھا۔ گو کوئی بھی بظاہر دہشت کو تسلیم نہ کرتا تھا مگر سب ہر لمحے کسی اَن جانے حادثے کے خوف سے سہمے تھے اور یہ سہم کچھ بے جا بھی نہ تھا کہ چند ہی ہفتوں بعد آخر وہ حادثہ رونما ہوا۔

وہ وسط دسمبر کی ایک شام تھی۔ میں چودھری صاحب کی دکان سے اٹھ کر گھر کی جانب آرہا تھا۔ ہر طرف سواریوں اور انسانوں کی ریل پیل تھی۔ دکانیں جگ مگ جگ مگ کرتی تھیں اور اہل شہر بظاہر زندگی کے جھمیلوں میں مصروف تھے۔ اس دہشت و درد بھری مہک کی لہریں کبھی کبھی کاٹ کر گزر جاتیں۔ میرا سر چکرا جاتا۔ میں رک جاتا اور پھر لہر کے گزرنے کے بعد چلنے لگتا۔ اب تمام اہل شہر کا یہی دستور ہو گیا تھا گو وہ خود اس کا علم نہ رکھتے تھے۔ کوئی باہر سے آنے والا انھیں دیکھتا تو حیران ہوتا کہ آخر یہ چلتے چلتے، کام کرتے کرتے ان آدمیوں کو کیا ہوتا ہے کہ اچانک رک جاتے ہیں، آنکھیں بند کرتے ہیں۔ سانس روک لیتے ہیں۔ اور پھر ایک گہری سانس لے کر مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہاں اب یہی ہم سب کا معمول تھا۔ وسط دسمبر کی اس شام میں پل کے قریب تھا کہ اچانک میرے سر پہ ایک برچھی لگی۔ چکرا کر میں نے بجلی کے کھمبے کا سہارا لیا اور دونوں ہاتھوں

سے سر تھاما۔ مگر برچھی تو کہیں بھی نہ تھی، اور نہ ہی برچھی مارنے والا کوئی ہاتھ۔
پھر مجھے معلوم ہوا کہ دراصل یہ برچھی نہیں اسی مہک کی نہایت شدید ——
ناقابل بیان حد تک شدید —— لہر تھی۔ خوف نے مجھے منجمد کر دیا۔ یوں لگتا
تھا کہ اس بُو یا مہک (معلوم نہیں وہ کیا تھی) کا سرچشمہ کہیں میرے قریب،
بہت قریب پہنچ گیا ہو۔ میرے شانوں کی ہڈیوں کے درمیان۔ گردن کے قریب۔
میرے عین پیچھے کہیں مجھ سے اتنا قریب کہ مجھ سے الگ بھی نہ ہو۔

مگر اچانک میری نظر سامنے آنے والی ایک عجیب و عجیب سواری پر
جا رُکی۔ وہ ایک بہت بڑا گڈا تھا جسے دو سفید بیل کھینچ رہے تھے۔ بیلوں کی
آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے تھے اور ناکوں میں موٹے موٹے رسّے۔ اور سفید
جلد تلے ان کی پسلیاں اور کولھوں کی ہڈیاں سانس لیتی تھیں اور رسّوں چڑھے
نتھنوں سے سانس کی گرم بھاپ —— گڈے کے چاروں طرف لکڑی کا
جنگلا سا بنا تھا اور اس کے اندر سیاہ پردے تنے تھے۔ دراصل وہ پردے بھی
نہ تھے جیسے ہلتی لہریں کھاتی اندھیرے کی دیواریں۔ سامنے سے تھوڑی سی جگہ
خالی تھی اور سیاہ پردے سے باہر دو گاڑی بان بیٹھے ہڈیوں بھرے اندھے
بیلوں کو ہانکتے تھے۔ ان گاڑی بانوں کی شکلیں اندھیرے کی وجہ سے میں نہ دیکھ
سکا۔ اور پھر سیاہ کپڑوں پر انھوں نے ملگجی چادروں کی بکلیں بھی مار رکھی تھیں
کہ ان کے آدھے آدھے چہرے چھپ گئے تھے۔ ان کے سر جھکے تھے جیسے لمبی مسافت
کے بعد نیند کا غلبہ ہو۔ ان کی پشت پر وہ سیاہ پردہ (یا دیوار) ہولے ہولے ہلتا
تھا۔ اور سیاہ پردے (یا دیوار) کے اندر اندھیرا اُبھرا تھا اور اس گھپ اندھیرے

کے گرد سیاہ پردے تنے تھے اور ان پردوں میں سے درد دہشت بھری مہک کی وہ لہریں اٹھتی تھیں جن کی کاٹ تلوار سے بڑھ کر تیز تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گاڑی میرے قریب سے گزر گئی اور میں چکرا کر کچے میں اتر کر قے کرنے لگا۔

مجھے معلوم نہیں اہلِ شہر نے اس شام اس گاڑی کو دیکھا یا نہیں اور جو دیکھا تو ان پر کیا گزری۔ میں بمشکل گھر پہنچا اور چارپائی پر گر گیا۔ ذکیہ نے مجھ سے بہت پوچھا مگر ایک کند دہشت نے میری زبان بند کر رکھی تھی۔

چند روز بعد اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ شہر کی میونسپلٹی انتہائی غیر ذمہ دار ہوتی جا رہی ہے۔ کوڑے کرکٹ بھری گاڑیوں کو سرِ شام شہر کی اہم سڑکوں سے نہیں گزرنا چاہیے۔ اس سے فضا متعفن ہوتی ہے اور اہلِ شہر کبیدہ خاطر۔

میں نے دفتر سے ہفتے بھر کی چھٹی لی تھی اور ان سات دنوں میں شہر کی کیفیت خود نہ دیکھ سکا۔ مگر اخبار سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک عجیب و غریب گاڑی سیاہ پردوں میں، غالباً کوڑا کرکٹ بھرے، شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہے، جس کے گاڑی بان خوابیدہ ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی مضافات سے ہوتی شہر سے گزرتی ہے اور پھر میونسپلٹی سے مطالبے کہ اس قسم کی ناخوش گوار کا شہر میں ورود بند کیا جائے یا ان کے لیے کم آباد رستہ مقرر کیا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ساتویں روز میں گھر سے نکلا۔ ان سات دنوں میں اہلِ شہر کس قدر بدل چکے تھے۔ چاروں سمت زرد زرد بے خواب چہرے چل پھر رہے تھے، جو بے فکر اور

لاپرواہ نظر آنے کی کوشش میں، بڑے درد بھرے انداز میں مضحکہ خیز ہو گئے تھے۔ (اور مجھے یاد آیا کہ آج صبح آئینے میں میرا چہرہ بھی ایسا ہی تھا) شہر میں اچانک تفریحی تقریبات بکثرت ہونے لگی تھیں اور اہل شہر جوق در جوق، ان تقریبات میں جاتے تھے، بلکہ وقت سے بہت پہلے دروازوں پر منتظر رہتے تھے اور واپسی پر ان کے چہرے پہلے سے زیادہ زرد اور مضحکہ خیز نظر آتے تھے۔

دفتر میں میں نے فائلوں کی طرف توجہ کرنے کی کوشش کی مگر بار بار میری آنکھوں کے سامنے وہ گاڑی آجاتی تھی۔ میونسپلٹی کے گڈے اس صورت کے تو نہ کبھی تھے۔ اس کے نیم خوابیدہ گاڑی بان، آنکھوں بندھے ہڈیوں بھرے بیل اور سیاہ پردوں کے اندر بھرا اندھیرا اور اس کی درد و دہشت بھری مہک جس نے اہل شہر کو متلی میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کے چہروں کا رنگ نچوڑ لیا تھا اور ان کی آنکھوں کی چمک دھو ڈالی تھی۔ وہ پردوں ڈھکا اندھیرا بار بار میرے سامنے آئے جاتا تھا۔ کسی چیز کی باس ایسی ہو سکتی تھی؟ تعفّن اور خوشبو کا مرکّب؟

اچانک ایک پاگل خواہش سے میرا گلا رک گیا۔ میں نے تصوّر میں دیکھا کہ میں اندھا دھند اس گاڑی کی جانب بھاگا جاتا ہوں اور ہاتھ سے اس کا پردہ ہٹاتا ہوں۔ اندر دیکھتا ہوں ——— اندر کیا ہے ———؟ اس تعفّن اور خوشبو کی اصل دیکھنے کی خواہش نے پاگل پن کی طرح مجھے جکڑ لیا۔ اس لیے آج پھر غیر ارادی طور پر میرے پاؤں راوی کے پل پر

دھبے پڑ گئے۔ سورج ڈوبنے میں ابھی کچھ دیر تھی اور درد و دہشت بھری
مہک کی لہریں ہولے ہولے تیز ہو رہی تھیں۔ جنگلے کے ساتھ لگ کر ایک
عجیب خوف نے مجھے گھیرا۔ دریا کی دلدل باہیں پسارے مجھے بلا رہی
تھی۔ تہہ دار ـــــ نگل جانے والی دلدل ـــــ اور مجھے خدشہ ہوا
کہ مبادا میں اس میں کود جاؤں اور اس میں اترتے سورج کے ساتھ
جذب ہو جاؤں اور ہمیشہ کے لیے اس چادر خون میں دفن کر دیا جاؤں۔
مجھے یوں لگا کچھ میرے قریب آ رہا ہے یا میں خود کسی چیز کے قریب پہنچ گیا
ہوں۔ وہ جس کا مجھے ـــــ نہیں ہم سب کو ـــــ ہم سے پہلوں اور
ہم سے بعد کے آنے والوں کو انتظار ہے اور میرا جسم پتھرا رہا ہے مگر اس
پل اور دلدل اور سورج سے نجات نہیں۔ وہ میرے اندر ہیں اور میرے
ساتھ۔ میں نے بے بس ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا کہ اچانک میرا دل
رُک گیا۔

تین شبیہیں ایک سی چال میں چادروں کی بکل مارے چلی آتی تھیں۔
میں پتھرائی آنکھوں سے مضافات کی سمت انھیں دیکھتا رہا، یہاں تک کہ
وہ لوگ قریب آن رُکے۔ آج معمر شخص کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے
تھے اور اس کی داڑھی ان سے تر تھی۔ باقی دونوں کی آنکھیں جھکی تھیں اور
دانت بھنچے تھے اور چہروں پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔

"تم اتنے روز کہاں غائب رہے ـــــ میں تمھیں ڈھونڈتا رہا۔ مجھے
بتاؤ یہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔" میں لڑکھڑاتی زبان میں ٹوٹتی سانسوں کے

کے درمیان کہا۔

"ہم انتظار کر رہے تھے۔ ہم اپنے آپ کو روک رہے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو باندھ رکھا تھا۔ یہ دیکھو"

معمر شخص اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی بانہیں میرے سامنے پھیلائیں اور اپنے شانے اور پشتیں جن پر رسوں کے نشان کندہ تھے۔

"ہم یہاں نہیں آنا چاہتے تھے ـــــــ" معمر شخص کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

"مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ـــــ" دوسرے کی بات ادھوری رہ گئی۔ یکدم وہ پیٹ پکڑ کے دوہرا ہو گیا اور اس کے ساتھی بھی شدید کرب میں جھک گئے۔ اس دکھ دہشت بھری مہک کی شدید لہریں گزر رہی تھیں، ہمیں کاٹتی ہوئی، ہمارے اندر جذب ہوتی، ہمیں چومتی ہوئی۔

"وہ دیکھو! معمر شخص نے اچانک دیہات کی طرف اشارہ کیا اور پھر تینوں کے چہرے موت کی زردی میں ست ہو گئے۔ میں نے دیکھا گرد اڑاتی راہ پر سیاہ گاڑی کا ہیولا ابھر رہا ہے۔ سفید بیل جن کی آنکھوں پر سیاہ کھوپے چڑھے ہیں اور ناکوں میں موٹے رسے اور سیاہ کپڑوں، ملگجی چادروں کی بکلوں میں چہرہ چھپائے نیم خوابیدہ گاڑی بان جو شاید اس کاٹتی چوستی دکھ دہشت بھری مہک کی ہمہ وقت قربت سے بے ہوش رہتے ہیں اور ان کے پیچھے سیاہ پردے ـــــ ایک لرزش مجھے سر سے پاؤں تک روند گئی۔ تینوں دیہاتوں کی آنکھوں سے چمک رخصت ہو گئی جیسے وہ موت کے قریب ہوں

گاڑی آہستہ آہستہ آ رہی تھی اور اس کی کاٹتی مہک ہمارا لہو چوس رہی تھی۔ گاڑی بالکل قریب آ گئی، یہاں تک کہ ہمارے برابر سے گزر گئی ــــــ گاڑی بانوں کے چہرے چادروں میں چھپے تھے اور سیاہ پردے (یا دیواریں) مدھم ہوا میں ہلنے کے باوجود نہ ہلتے تھے۔

اچانک وہ تینوں اس گاڑی کے پیچھے بھاگے اور ایک ساتھ انھوں نے پردہ اٹھا دیا۔ اس کے سر پردے میں چھپ گئے مگر پردہ اٹھنے کے باوجود نہ اٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دہشت زدہ غیر انسانی چیخ کے ساتھ وہ تینوں پلٹے اور دیوانوں کی صورت دیہات کی طرف بھاگے۔

"تم نے کیا دیکھا؟ تم نے کیا دیکھا؟" میں ان کے پیچھے بھاگا مگر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ بھاگتے رہے۔

"بولو ــــــ بولو ــــــ" میں نے ان کی منت کی مگر وہ بھاگتے رہے۔ یہاں تک کہ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ بھاگتا شہر سے کوسوں دور نکل آیا۔

"مجھے بتاؤ ــــــ مجھے بتاؤ ــــــ" بالآخر میں نے معمر شخص کی چادر پکڑ لی۔ اس نے اپنی پھٹی پھٹی آنکھیں میری جانب پھیر دیں اور پھر اپنا منہ کھول دیا۔ اس کی زبان تالو کے ساتھ چپک چکی تھی۔

وہ تینوں گنگ ہو چکے تھے۔

میں چکرا کر گر گیا مگر وہ تینوں بھاگتے رہے اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے پیچھے گرد اڑتی رہی، پھر وہ بھی بیٹھ گئی اور میں گھر لوٹ آیا۔

مہینوں میں نے ان تینوں کو ڈھونڈا ہے مگر کہیں ان کا نام ونشان نہیں۔
اسی دن سے گاڑی نے اپنا رستہ بدل لیا ہے۔ اب وہ شہر سے نہیں گزرتی،
پل سے ہو کر کچے میں اتر جاتی ہے اور مضافات کا رخ کرتی ہے۔ اہلِ شہر
اس دُکھ دہشت بھری مہک کے اس طرح عادی ہو چکے ہیں کہ اس کا احساس
نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ وہ تلوار کی کاٹ کاٹتی لہریں مرگئیں۔ بھولی
بسری کہانی کی طرح ــــــ مگر میں اب بھی انھیں اپنے جسم میں اترتا
جان پاتا ہوں اور کوئی دن رات کے اندر بولتا ہے: "اب تمھاری ہے۔
اب تم دیکھو گے۔"

اور آج میں اس پُل پر آن کھڑا ہوا ہوں، اس سواری کے
انتظار میں۔

غیاث احمد گدی

تج دو تج دو

یہ الفاظ......

بار بار اس کی سماعت کے تعاقب میں یہ الفاظ آتے رہتے۔ جب وہ سونے کے لئے بستر پر دراز ہوتا اور خاموش سنسان کمرے اور اس کی دیواروں کو تکتا تکتا تھک جاتا تو آنکھیں بند کر لیتا، پھر بند آنکھوں میں جانے کتنی صدیوں کی ویرانیاں پھیل جاتیں، افسردگی کا تسلط ہو جاتا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کے ہونٹ ہلتے، جہاں سے گویائی ہولے سے سر اٹھاتی، اور کچھ ایسے الفاظ ادا ہوتے جن کو سننے کے لئے اس کی سماعت تیار نہ ہوتی۔ وہ کان بند کر لیتا اور آنکھیں اس وقت آپ ہی آپ کھل جاتیں۔ کمرہ ویسے ہی ویران ہوتا، تنہا تنہا، پھر کہیں سے غبار اُٹھتا، جس کو دباتے دباتے اُس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ ضبط، ضبط اس کے اختیار سے باہر کی چیز ثابت ہوتا۔ وہ آنکھیں میچتا تب اُس کی آنکھوں سے درد گرم

قطرے آہستہ سے ڈھلک آتے۔

جس دفتر میں وہ کام کرتا تھا اس کے صدر دروازے سے عین بیس گز کے فاصلے پر ایک دُم کٹا کتّا ہر روز اس کی راہ تکتا۔ یہ سلسلہ بہت دنوں سے نہیں اب چند دنوں سے شروع ہوا تھا یہی کوئی پانچ چھ مہینے سے تو وہ دُم کٹا کتّا چلڈرن پارک کا جو موڑ داہنی طرف مڑتا تھا وہیں سے اس کے ساتھ ہو لیتا اور ٹھیک اُس سے دو انچ کے فاصلے پر اُس کے پیچھے پیچھے چلا کرتا۔ ایسا کہ کتّے کا تھوتھنا اُس کے پتلون کی مُہری سے کبھی کبھار چھو بھی جاتا۔ پہلے دن تو اس نے کتّے کی اس حرکت پر اُسے ڈانٹا، جھڑکیاں دیں مگر کتّے نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یوں ہی وہ گردن جھکائے چپ چاپ چلتا رہا۔ گویا یہ اُس کا اپنا پالتو کتّا ہو اور وہ اس کی محافظت میں ہو۔ دوسرے دن اس نے اس کو لات رسید کی، دُھتکارا، مارنے کے لئے پتھر اٹھایا، جب بھی وہ بدستور زمین سونگھتا چلا گیا —— پھر ایک دن اس نے سڑک پر پڑے ہوئے ایک بید سے اس کی خوب مرمّت کی اور مارتے مارتے ایک دم سے نڈھال کر دیا۔ اتنا مارا کہ وہ اندھا ہو کر فرش پر گر گیا۔ وہ کچھ دور چلا، پلٹ کر دیکھا تو اسی طرح فرش پر وہ کتّا اوندھا پڑا بیں بیں کر رہا ہے۔

وہ آگے بڑھ گیا اور سو دو سو قدم چلتا رہا، مگر کتّے کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اب اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ یہ کیا ٹنٹا تھی، کم بخت کتّے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جب تھوڑی دور چلنے کے بعد پلٹ کر دیکھا اور کتّا نہیں آیا تو اسے اور بھی اطمینان ہوا۔

اس دن کچھ عجیب بات ہوئی۔ اسی چلڈرن پارک میں ایک بہت بڑا مجمع تھا۔ بے شمار آدمیوں کی بھیڑ تھی۔ آخری سرے پر کوئی آدمی زور زور سے تقریر کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں جب وہ آدمی رکتا تو آدمیوں کے گھنے جنگل سے تالیوں کی آواز اٹھتی۔ تڑاتڑ، تڑاتڑ......

وہ کچھ دیر تک خاموشی سے مجمع کو تکتا رہا، دلچسپی سے اس کی آنکھیں اور کان دونوں لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جب ہی اس کی نگاہیں دس گز کے فاصلے والے درخت پر گئیں۔ بڑا گھنا، بڑا غلیظ سا، املی کا پیڑ تھا، املی کا تھا؟...... ہاں، املی ہی کا تھا، جس کی ایک شاخ پر ایک بیحد گندہ، بیحد کراہیت کرنے والا پرندہ بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ پرندے اور درخت پر دھیان نہیں دیتا، مگر جیسے ہی مجمع میں تالیوں کی بے پناہ آواز گونجی، پیڑ پر سے قیں ں ں ں...... کی ایک اور گھناؤنی آواز سنائی دی، ایسی کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جبھی اس کی نگاہیں اس درخت کی طرف پرندے پر اٹھیں، وہ سر سے پاؤں تک سہر گیا۔ اسے عجیب سا تجسس ہوا، ایسا کیوں ہوا، ہو سکتا ہے اس کی سماعت اور بصارت دونوں نے مل کر سازش کی ہو اور اسے دھوکا دیا ہو۔ چنانچہ جب دوسری بار تالیاں بجنے لگیں تو وہ قیں کی آواز سنتے ہی پرندے کی طرف مڑ گیا۔ اس نے دیکھا، جب تک تالیاں بجتی رہیں وہ منحوس پرندہ قیں قیں کرتا گردن کو اوپر سے نیچے گراتا اٹھاتا رہا ہے۔ اس وقت پرندے کے بشرے پر ایسی کیفیت تھی گویا وہ زور زور سے ہنس رہا ہو۔۔۔ قیں قیں کی مکروہ آواز کیا تھی؟ یقیناً اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ اس نے

سوچا ٹھیک ہے گویا پرندے نے قہقہہ لگایا ہو۔

ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اس نے مجمع کی طرف دیکھا۔ اس لچھے دار تقریر کرنے والے کی سمت دیکھا، پھر اپنے آپ سے سوال کیا، ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ یہ نئی بات، تقریریں یہاں برابر ہوتی ہیں، تالیاں بھی بجتی ہیں، مگر اس سے پہلے یہ عجیب صورتِ حال درپیش نہیں آئی تھی؛ جہاں تک اس کی یادداشت کا تعلق ہے کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ سب محض اتفاق ہے۔ پرندہ، جو یہاں بیٹھا ہے، یہ بھی اتفاق ہے اور یہ بھی کہ وہ گردن نیچے اوپر کرتا ہے اور یہ بھی عین اتفاق ہے کہ اسی وقت تالیاں بجتی ہیں۔ یا پھر یہ سنجوگ کی بات ہے کہ جب تالیاں بجتی ہیں، تب ہی پرندے کے گلے سے آواز نکلتی ہے۔ یا یوں کہ...... اس ایک دانا آدمی کی طرح سمجھانے کے سلسلے میں ہر جانب سے تسلی کرنا چاہی کہ ممکن ہے، تالیوں کی آواز سن کر ہی پرندے کی آنکھیں کھلتی ہوں اور اس آواز کے صدمے سے اس کے گلے سے قیں کی صدا پھوٹتی ہو۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، بس یہی ٹھیک ہے۔ پچھلے چند مہینے جو وہ بیمار رہا ہے نا، بس اسی سبب وہ بہت زیادہ سوچنے لگا ہے اور کچھ الٹا سیدھا بھی سوچنے لگا ہے، اور ضرورت سے کچھ زیادہ بھی، ورنہ بات بس اتنی ہے کہ تالیوں کے شور سے پرندے کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور گلے سے آواز بھی نکلتی ہے۔ اس میں کوئی تعجب خیز پہلو ہے ہی کہاں؟ بس بس اتنی سی بات ہے۔ اسی لئے اس کی توجہ چند منٹوں میں مجمع کی طرف منتقل ہو گئی۔

تقریر کرنے والا مہاپرش کوئی نہایت اہم نکتے پر بول رہا تھا، اس کے دونوں ہاتھ فضا میں زور زور سے تلواریں چلا رہے تھے اور سننے والا مجمع بے حد دھیان سے سانس روکے کھڑا تھا۔ تقریر کی آواز تو اس تک نہیں آرہی تھی، مگر بات ضرور اہم تھی۔ اس نے اندازہ لگایا، جب ہی لوگ بُت بنے،........ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ مجمع نے پھر زور سے تالیاں بجائیں...

"تج دو تج دو......"

'ارے یہ کیا، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ آواز کہاں سے آئی۔ مگر......
مگر پھر آواز آئی، تج دو......

یہ تو گویا پرندے کے حلق سے آئی تھی۔ اسے بے حد تعجب ہوا، شاید اس کی سماعت نے غلطی کی ہو۔ یہ دو الفاظ، ایک پرندہ انسانوں کی زبان کیسے بول سکتا ہے؟ طوطا ہوتا تو اور بات تھی۔ کہیں سے رٹے رٹائے الفاظ بولتا رہتا۔ یہ صلاحیت صرف طوطا اور مینا کو ودیعت ہوئی ہے کہ انسانوں کی نقّالی میں ان کی زبان آدمیوں کے الفاظ ادا کر سکتی ہے۔ مگر یہ پرندہ نہ طوطا ہے نہ ہی مینا! کوئی اور پرندہ، ایسا نہیں بول سکتا۔ یقیناً یہ اس کی لنگڑی سماعت کا قصور ہے۔

اتنے میں تقریر ختم ہو گئی۔ لوگ تتر بتر ہونے لگے، چند جوشیلے آدمیوں نے منبر پر کھڑے تقریر کرنے والے صاحب کو کندھوں پر اٹھالیا، اور چیختے چلاتے سڑک کی طرف روانہ ہوئے، بڑا جوشیلا اور بدن میں لہو کی رفتار تیز کرنے والا منظر تھا۔ وہ محویت سے چپ چاپ کھڑا کھڑا، اس حیات افروز منظر کو تکتا رہا،

خوشی سے اس کی باچھیں کھل اٹھیں کیونکہ دیر سے اُس کی رگوں میں منجمد خون رواں ہو گیا تھا، یہ سب اسے بہت اچھا لگا۔

ذرا دیر میں مجمع پھٹ گیا، نعرے لگاتے لگاتے کچھ لوگ مہاپرش کو کار تک لے گئے۔ عین اُسی وقت پھڑپھڑ کرتے ہوئے پرندے نے پورے مجمع کے اوپر سے چکّر لگایا، اور مشرقی افق کی طرف ہو لیا۔ اس نے حیرت سے دیکھا اور غور کیا تو اس وقت بھی جب پرندہ لوگوں کے سمندر پر چکر لگا رہا تھا، 'تج دو، تج دو، کی آواز سنائی دے رہی تھی، زور زور سے اور جلدی جلدی ...... تج دو، تج دو ......

کیا یہی الفاظ تھے یا کچھ اور تھے؟ ہو سکتا ہے 'تج دو، کی بجائے کوئی اور الفاظ ہوں ملتے جلتے، ہم آواز سے، جیسے بہت سے ہم شکل آدمی ہوتے ہیں، جن میں اس درجہ مشابہت ہوتی ہے کہ بالکل ایک سے لگتے ہیں پھر بھی دونوں میں، غور سے دیکھنے میں فرق رہتا ہے، ایسے ہی دو الفاظ ملتے جُلتے ہوں جن کے باعث اس کے ذہن نے ایک مفہوم پیدا کر لیا ہو...... یہ سب بیکار باتیں ہیں، وہ چند دنوں سے بہت سوچنے لگا ہے اتنا زیادہ کہ سوچ کے بوجھ تلے اس کا ذہن کچلا چلا جاتا ہے۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے، دھیرے دھیرے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا، اس نے پان کی دکان سے ایک پیکٹ سگریٹ خریدی، پیسے دئے اور سنیما ہال کی سربلند عمارت کی طرف دیکھا، جہاں کسی فلم کا ایک خوبصورت پوسٹر آویزاں تھا۔ پوسٹر خوبصورت تھا۔ ایک نیم عریاں حسینہ سمندر کے کنارے ریت پر لیٹی

لپٹی ہوئی تھی۔ ایسی کشش تھی کہ آدمی دنیا و مافیہا دونوں کو فراموش کر جائے۔
جیبھی لوگوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ اس نے دیکھا، ان میں سے
زیادہ تر وہی لوگ تھے جو ابھی سیاسی جلسہ میں زور زور سے تالیاں بجا رہے
تھے۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیروں کے پاس کوئی چیز متحرک
ہے۔ اس کے ذہن نے دفعتاً بہت سی باتیں، بس ایک لمحہ میں سوچ لیں۔ مگر وہ
سب نہیں تھا، جو کچھ اس نے سوچا تھا، یہ تو وہی دُم کٹا کتا تھا۔

یہ پھر آ گیا۔ اس نے سوچا۔ یہ کیسے اتنی دور تک اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا
چلا آیا۔ کتے کی قوتِ شامہ کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ بہت تیز ہوتی ہے،
چنانچہ یہ دُم کٹا کتا اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلا آیا۔

اب ہر روز کا معمول ہو گیا تھا، کتا اسے چلڈرن پارک کے موڑ پر سے
ملتا اور اس کے لاکھ دھتکارنے کے باوجود پیچھے پیچھے چلتا۔ گھر کے دروازے
تک آتا۔ پھر وہ دروازہ بند کر لیتا، ذرا دیر تک وہ کتا دہلیز کے آس پاس ٹہلتا
پھر نامعلوم سمت چلا جاتا۔ چند منٹوں کے بعد وہ دروازہ کھول کر دیکھتا
کتا جا چکا ہوتا تب وہ اطمینان کا سانس لیتا اور اپنی بیوی سے باتیں کرتا،
چائے پیتا، ہنستا بولتا۔

اس کی بیوی نے ایک دن ٹوک دیا۔ "یہ آپ کمرے میں آتے ہی دروازہ
کیوں بند کر لیتے ہیں؟"

"دروازہ بند کر لیتا ہوں۔"

"ہاں، اور کچھ دیر بعد کھول کر باہر دیکھتے بھی ہیں، کوئی آدمی آپ کا پیچھا

کر رہا ہو۔"

"کوئی آدمی پیچھا کر رہا ہو۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میرا کون پیچھا کر سکتا ہے۔"

اس کی بیوی نے بشاشت سے کہا۔ "نہ کر رہا ہو گا، مگر آپ کے چہرے پر کچھ ایسے اثرات رہتے ہیں اس وقت، ایسا ہی لگتا ہے!"

وہ چونک گیا، یہ بات سچ ہو سکتی ہے۔ وہ گھبرا جاتا ہے، اس نے سوچا، اپنی بیوی کو وہ سب کچھ بتا دے گا، مگر پھر آپ ہی خود کو سمجھانے لگا، اس میں بتانے کی بات ہی کیا ہے۔ نیلو ہنسنے لگی تھی، آخر اتنی سی بات ہے ناکہ دُم کٹا کتّا چلڈرن پارک سے اس کے ساتھ ساتھ گھر تک آتا ہے۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے! وہ کتا کوئی گزند نہیں پہنچاتا، معمولی بات ہے، بے حد معمولی بات ہے، اتنی سی بات پر وہ گھبرانا بھی چھوڑ دے گا، ہمیشہ کی طرح خوش و خرم رہے گا۔ کوئی اثر ہی نہیں لے گا۔

"اب آپ سوچنے کیا لگے، اس طرح۔" اس کی بیوی نیلو نے چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا، بقراط مت بنیے۔ ٹوٹو کی چٹھی آئی ہے، اس کا نانی کے پاس جی نہیں لگتا۔" لیکن گویا اس نے دوسری بات سُنی ہی نہیں۔ فوراً جواب دیا۔ "کیا میں بہت سوچنے لگا ہوں۔ ٹھیک ٹھیک......"

"عجیب آدمی ہیں۔" نیلو نے تعجب سے کہا۔ "میں ٹوٹو کی بات کر رہی ہوں، آپ......"

اس روز اس نے سوتے وقت عہد کیا کہ وہ اب یوں ایک چھوٹی سی بیحد غیر اہم بات کے لئے پریشان نہ ہوگا اور اس میں جو ذرا لاتعلقی پیدا ہونے لگی ہے،

ہر چیز سے جو وہ غلط طور پر کٹا کٹا رہنے لگا ہے، اس کو روک دے گا۔ یہ اس کی شاعرانہ لاپرواہی، مگر ایک بیمار کی سی سوچنے کی عادت ٹھیک نہیں۔ یہ کوئی بات نہیں ہے۔ چنانچہ دوسرے دن وہ دفتر میں خوش خوش کام کرتا رہا۔ ہلکا پھلکا اس کے دونوں شانے جو ادھر کئی دنوں سے بھاری بھاری لگتے تھے، آج سبک تھے۔ بے فکری کی ایک کیفیت تھی جو اس کے اندر اور باہر دونوں اطراف میں مسلّط تھی، کام بھی کچھ زیادہ کیا گیا، دل جمعی بھی میسّر آئی اور سارا دن ذرا مزے ہی مزے میں گزر گیا۔ شام کو جب دفتر بند ہونے کا سمے آیا، چیف اڈیٹر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ جا کر خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں اس کے علاوہ چند اور لوگ بھی تھے۔ دو اسسٹنٹ اڈیٹر اور چھ کالم نویس۔ سبھوں کے چہرے بشاش تھے اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

جب چائے کا دور چل چکا تو ایک غیر رسمی میٹنگ شروع ہوئی۔ صرف چند جملوں نے بہت سی باتیں اڈیٹر نے بتائیں۔ وہ یہ کہ پندرہ بیس دن پہلے یہ اخبار بک چکا ہے، اسے ملک کے بہت بڑے سیٹھ، فلاں نے اتنی کثیر رقم کے عوض لے لیا ہے۔ اخبار خریدنے والا سیٹھ بہت نیک دل انسان ہے اس نے تمام ملازمین کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا ہے اور دوسری سہولتیں بھی مہیّا کر دی ہیں۔

...... اور اس کے بدلے میں ....

چیف اڈیٹر خاموش ہو گیا۔ ذرا ٹھہر کر بشاشت اور وقار سے اس نے کہا "اور اس کے بدلے میں انھیں کچھ نہیں چاہیئے، حتیٰ کہ پالیسی میں بھی کوئی ذرہ برابر تبدیلی نہیں چاہیئے......"

چیف اڈیٹر یہاں خاموش ہو گیا اور جبھی تڑ تڑ کر کے تالیاں بجیں....

حتیٰ کہ پالیسی...... تڑ تڑ تالیاں تالیاں........

دفعتاً وہ چونک اٹھا، جب زور زور سے تالیاں بج رہی تھیں، جبھی اس کے کان بجے، ان دو الفاظ کی گونج سنائی دی، اس نے جلدی سے گردن اٹھا کر دیکھا، کہیں کچھ نہیں تھا، وہ منحوس پرندہ؟ کہیں نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پھرتے پھرتے دور روشن دان ٹک گئیں، وہ پرندہ نہیں تھا، مگر.......

.... مگر .... مگر کچھ تھا، روشن دان کے شیشے کے پیچھے کچھ سایہ سا تھا، اس وقت پھر اس کے ساتھیوں نے اڈیٹر کی کسی بات پر، جسے وہ سن سکا تھا، تالیاں بجائیں۔ اسی دم روشن دان کے زرد رنگ شیشے کے پیچھے کوئی سایہ سا کانپا، کچھ آواز بھی آئی، پھر اس کی سماعت نے سنا۔ تج دو۔ ...... تج دو۔

عجیب سی سراسیمگی کے زیر اثر اس نے پاس کھڑے اپنے ایک ساتھی کو بازو سے پکڑ کر احتیاط سے پوچھا۔ "تم نے کچھ سنا؟"

"کیا؟" اس کے ساتھی نے تعجب سے پوچھا۔

"ذرا دیکھو تو روشن دان کی طرف........"

اس کے ساتھی نے روشن دان کی طرف مڑ کر دیکھا...... کیا ہے، کچھ بھی تو نہیں ہے، تم اتنے ڈر کیوں رہے، کیا ہو گیا تمہیں۔"

"بات یہ ہے۔" اس نے سنبھالا لیا۔ کیا تم نے کوئی الفاظ نہیں سنے جیسے کوئی کہہ رہا ہو........"

وہ آدمی ہنسنے لگا۔ تم پاگل ہو گئے ہو، جو کچھ تم سن رہے ہو وہ تو میں بھی سن رہا ہوں۔ سبھی لوگ یہاں سن رہے ہیں۔"

"وہ کیا ؟"

"یہی جو چیف اڈیٹر صا........

پھر زور زور سے تالیاں بجیں اور میٹنگ برخاست ہو گئی۔

وہ کچھ زیادہ بدحواس تھا۔ دن بھر جو اس نے خوشی خوشی اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھا تھا اس کی ساری خوشیاں مٹی میں مل گئی تھیں، اس کا رنگ قدرے زرد ہو گیا تھا، جب اس نے دفتر کی سیڑھیاں پار کر کے چلڈرن پارک کا فاصلہ طے کیا کہ عین اسی وقت دم کٹا کتا اس کے پیچھے لگ گیا۔

اس نے آج کتے کو کچھ نہیں کہا، نہ ڈانٹا، نہ دھتکارا، نہ مارا کچھ نہیں، بلکہ ...... بلکہ اسے اچھا لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ شہر کی اس بھیڑ میں جو وہ چند دنوں سے اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کر رہا ہے خصوصاً دفتر سے گھر آتے وقت اس کو سارے چہرے اجنبی لگتے ہیں وہاں یہ کتا اس کا صورت آشنا نکل آیا ہے۔

اجنبی اور صورت آشنا کی بات نکلی تو ایک دن بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ اس دن وہ دفتر سے گھر پہنچا، تو اس کی بیوی کچھ ناراض تھی۔ کیوں، کیوں اس نے کوئی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس سے نیلو کو ناراضگی ہو۔ پھر نیلو تو اس سے ناراض ہوتی بھی نہیں تھی۔ آج کیا بات ہوئی، بہت منانے سمجھانے پر وہ رو پڑی۔

"کل ڈیڈی آئے تھے۔ کہہ رہے تھے تم نے بازار میں ان کو دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں، بات تک نہیں کی۔"

"میں نے کب، کب؟ کہاں، کل تو میں نے ان کو دیکھا بھی نہیں"۔

"وہ تمھیں پکارتے رہے، تم نے ان کی طرف دیکھا بھی بلکہ چند سکنڈ تک دیکھتے رہے مگر ان کی بات کا جواب نہیں دیا اور اجنبیوں کی طرح چل دیئے"۔

اس نے گھنٹوں اپنے ذہن پر زور دیا، مگر کچھ یاد نہیں آیا۔ کہاں نیلو کے ڈیڈی اسے ملے تھے، کب ملے تھے۔ نیلو کہتی ہے ان کی طرف تکتے رہے اور آگے بڑھ گئے۔ اس دن عثمان نے بھی راہ چلتے اسے دیکھ لیا تھا کہ سامنے دیکھ کر بھی آگے بڑھ جاتے ہو۔

"نہیں یار.......... اس نے لجاجت سے جواب دیا۔ "معاف کرنا دیکھا نہیں"۔

"یہ دیکھو بے شرمی، سالے دیکھا نہیں تھا۔ دیکھتے رہے منٹوں اور آگے بڑھ گئے، حرام زادے چشم پوشی کرتے ہو..........."

اس نے شیلو کو من وعن یہ واقعہ سنا ڈالا —— "کیوں نیلو، ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"سوچتے رہتے ہوں گے ہر دم"۔ نیلو ہنسی۔ "پڑ گیا ہوگا کسی الّو کا سایہ"۔

الّو کے نام پر وہ چونک گیا۔ "الّو۔ ہاں وہ پرندہ، اس منحوس پرندے کی شکل بھی الّو ہی سے مشابہ تھی۔ اب اسے یاد آگیا۔ ویسا ہی گندہ، غلیظ، مکروہ، ویسی ہی بڑی بڑی گول گول آنکھیں اور اس طرح قیں ں ں..... کرتے وقت اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ یقیناً وہ پرندہ الّو ہی ہوگا۔ الّو کو اس نے کبھی دیکھا نہیں، مگر اس کی ہیئت کا اسے پتہ تو تھا، وہ پرندہ یقیناً الّو ہی ہوگا۔ الّو ہی... الّو ہی......"

"اچھا، ذرا یہ بتاؤ تو الّو ہوتا کیسا ہے؟" اس نے کمال سنجیدگی سے یہ سوال اپنی بیوی سے کیا، جب وہ اس کے پہلو میں لیٹی...... اس کا پیار لینے کے لئے جھک رہی تھی۔ اس نے انگلیاں بڑھا کر اسے روک دیا۔ نیلو ٹھہر گئی، اس کے دونوں جاں بلب ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔

"کیوں نیلو کیسا ہوتا ہے؟

اس کی بیوی جھلا گئی، وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی توہین سے بے حد بدمزہ ہو کر وہ تیز تیز بڑھی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں آئینہ تھا۔ "ایسا ہوتا ہے" اس کے چہرے کے سامنے کر کے کہا اور آئینے کو پلنگ پر پٹک دیا۔

پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور آئینہ اٹھا کر الماری میں رکھا اور پاس کھڑی بیوی کی کمر میں باہیں ڈال کر اسے منانے لگا۔ بہت سارے پیار اس نے آناً فاناً لے ڈالے، ذرا دیر میں اس کی بیوی من گئی۔ جبھی اس نے اس کا ایک طویل بوسہ لیتے ہوئے اُداسی سے کہا کہ وہ آج کل کچھ بُجھا بُجھا رہنے لگا ہے۔ شاید اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ نیلو نے بتایا کہ اس میں وہ تپاک، وہ گرم جوشی بھی نہیں رہی ہے۔ لگتا ہے وہ اس وقت وہاں ہوتا ہی ہے کسی اور دنیا کی سیر......

کیا بات ہے؟ اس میں اتنی بہت ساری تبدیلیاں کیوں آتی جا رہی ہیں، کہاں سے آتی جا رہی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ کل کے مقابلے میں آج وہ بہت سوچنے لگا ہے، کیا سوچتا رہتا ہے وہ، اسے خود پتہ نہیں۔ کیوں سوچتا ہے وہ، اسے کس بات کی کمی ہے؟؟؟

بہت سارے سوالات۔ اس کے ذہن میں گونجتے رہتے اور وہ خاموشی سے پلنگ پر لیٹا رہتا۔ اسے کس بات کی کمی ہے۔ خوب صورت بیوی، پیار کرنے والے پھول سے بچے، ملک کے سب سے اہم اخبار میں ملازمت، اچھی تنخواہ، بلکہ اِدھر تنخواہ میں اضافہ بھی........

کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ اصل مسئلہ تنخواہ میں اضافے کا ہی ہے۔ جس دن سے اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے یا اضافہ ہونے کی پلاننگ ہوئی ہے' اسی دن سے چند نئی نئی باتیں اس کی زندگی میں ظہور پذیر ہونے لگی ہیں۔ اسی دن سے وہ دم کٹا کتا اس کے پیچھے لگ گیا ہے اور اس کے چند دنوں بعد ہی وہ پرندہ نظر آیا۔ وہ مکروہ پرندہ' وہ اُلّو ــــــ ہاں الّو ہی۔ کہتے ہیں جس جگہ یہ پرندہ، مطلب الّو بسیرا لیتا ہے وہاں نحوست پھیلتی ہے۔ ویرانی براجنے لگتی ہے۔ اُلّو، پھر املی کا پیڑ بھی منحوس، اس نے سن رکھا تھا کہ جو شخص مسلسل املی کے سائے تلے بیٹھتا ہے' اسے کوڑھ یا جذام ہوجاتا ہے۔ پہلی بار اُس نے املی کے پیڑ ہی پر اس پرندے کو دیکھا تھا۔ اس الّو کو جس کی صورت سے ہنسی پھوٹتی تھی۔ بڑی گھنی ہنسی اور گلے سے قیں ں ں....... کی مکروہ آواز پیدا ہوئی تھی ..... تو کیا کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ کوئی بربادی آنے والی ہے؟؟؟

اس نے اپنے ایک دوست سے سنجیدگی سے پوچھا۔" سچ بتاؤ، کیا تم محسوس کرتے ہو کہ........ کہ کوئی بربادی آنے والی ہے۔؟"

" کیسی بربادی ....؟" اس کے دوست نے وہسکی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔" میں تو ایسا نہیں محسوس کرتا، میں تو مزے میں ہوں' میری سانس

سالی مرگئی اور میرے لئے تین لاکھ......"

تو کوئی بربادی وربادی نہیں آنے والی ہے، یہ سب اس کا وہم ہے۔ وہ بہت سارے اتفاقات جو پے درپے اس کی زندگی میں رونما ہوئے ہیں، جن کے تسلسل کے باعث اس کے ذہن نے کئی نتائج برآمد کرلئے ہیں کہ کوئی بات ہونے والی ہے ورنہ حقیقتاً ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سبھی خوش وخرم ہیں۔ وہی صرف خواہ مخواہ کا بوجھ اُٹھانے لگا ہے۔

وہ بھی خوش رہنے کی کوشش کرے گا۔ یہی ٹھیک ہے، وہ اتنا سوچے گا نہیں، یہ بیجا سوچ ہی کا نتیجہ ہے کہ اس کی زندگی میں بہت سی غلط باتیں راہ پانے لگی ہیں۔ وہی غلط باتیں، جیسے اُلّو کی آواز پر اس درجہ سوچنا، جیسے اپنے عزیزوں کو دیکھ کر بھی آگے بڑھ جانا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے۔ وہ سوچ کی دنیا میں اس درجہ کیوں دبا رہتا ہے کہ آس پاس کی چیزوں سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ یہ تو نقصان دہ ہے۔ نہیں وہ ایسا نہیں کرے گا۔ ساری خلقت جس بہاؤ میں رواں ہے وہ بھی بہے گا، وہ بھی وہی کرے گا.......

پھر زندگی معمول پر آنے لگی۔ اس نے سوچنا چھوڑ دیا۔ ایک آزار سے گویا نجات ملنے لگی۔ اچھا ہے، جیسے سب لوگ رہتے ہیں، وہ بھی رہے گا۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتا۔ لوگوں کے ساتھ ہنستا بولتا، شام کو دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں بھی کرتا۔ بیوی کو پیار بھی کرتا، خوب خوب، ادھر اس کے پیار کرنے کا سلسلہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ جبھی نیلو جھینپ کر، مسکرا کر اور اک ذرا دب کر

ایک روز کہہ اٹھی "ہونہہ اتنا بھی کیا چونچلا، لگتا ہے ایکٹنگ کر رہے ہو۔"

وہ دھک سے رہ گیا۔ کیا اس کے رویے میں فرق آگیا ہے، بناوٹ؟؟

لیکن واقعی بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ واقعی وہ کچھ زندگی کو زیادہ شدت سے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسج کے بغیر۔ لیکن وہ کیا کرے۔ نیلو کو پیار نہیں کرتا، جب بھی شکایت۔ یہ بناوٹی زندگی تو اس نے کبھی پسند نہیں کی۔ پھر ایسا کیوں ہوتا جارہا ہے۔ نہیں نیلو غلط سوچ رہی ہے۔ یوں ہی اس نے رواروی میں یہ جملہ کہہ دیا، بناوٹ، تصنع کہاں سے آئے گا۔ ...... وہ تو شروع سے اس بات کے لئے مشہور ہے بلکہ ...... بلکہ بدنام ہے کہ وہ بہت کھرا ہے بہت صاف گو۔!

مگر یہ بناوٹ۔ اس نے غور کیا، جب سے اخبار نئے مالک کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے، اسٹاف بہت خوش رہنے لگا ہے۔ ان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے مگر ایک بات اُس کے ذہن نے عجیب محسوس کی تھی۔ ان کے حرکات و سکنات میں کچھ نئی بات راہ پانے لگی ہے۔ یہ نئی بات کیا تھی، اس دن اس نے اپنے ذہن پر بہت زور دیا مگر کچھ سمجھ میں نہیں آئی ــــــ کوئی نئی بات تھی جیسے کوئی پانی کا گلاس تھامتے وقت بھی احتیاط برتے کہ لیتے وقت وہ گلاس خود اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے۔

وہ دن بھر یہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا رہا، دفتر میں کام کرتے وقت آج پھر اس کا من نہیں لگا، ایک نامعلوم سی خلش اسے تنگ کرتی رہی، آج پھر وہ پٹری سے اُتر گیا۔ یہ کم بخت اُلّو کا سایہ ہے، یہ سوچتے اور اُلجھتے رہنے کا

دورہ، ذرا ذرا سی بات، اتنا ہی تو نیلوفر نے کہا تھا کہ پیار کرتے وقت بناوٹ سی ....

یہ سلسلہ شروع ہوا تو وہ سوچتا ہی چلا جا رہا ہے۔ بس اس نے ذہن کو جھٹک دیا۔ اب وہ کچھ نہیں سوچے گا۔ جتنی اوٹ پٹانگ باتیں اس کے اندر کی دُنیا میں در آئی ہیں ان کو اس نے سختی سے روک دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ذہن کو نیلو کے جسم، خوب صورت اور ایک بچّہ ہونے کے بعد بھی نئی بنی ہوئی چارپائی کی طرح کے جسم کی طرف منتقل کر دیا۔ اس نے نیلو کی طرف جو اس کے پہلو والے پلنگ پر سوئی ہوئی تھی۔ صرف تصور ہی تصور میں اُس کے جسم کو ننگا کرتا رہا، اندر ہی اندر، لطف اندوز ہوتا رہا..

اور یوں کئی منٹ گذر گئے، اس نے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کیا اور لگا کہ ایک بوجھ دھیرے دھیرے اُس کے وجود پر سے اُتر رہا ہے اور کہیں سے ننّھی ننّھی نیند کی پریاں آنکھوں میں براجنے لگی ہیں......... اور ذرا دیر کے بعد وہ واقعی سو گیا .... گہری نیند کی دنیا میں ایسا کھویا کہ صبح صادق کے وقت اُس کی آنکھ کھُلی ....

اب وہ یہی کرتا۔ جب بھی اُس کے خیالات اُلجھنے لگتے یا اوٹ پٹانگ باتیں سُتانے لگتیں، وہ تصور ہی تصور میں نیلو کو عریاں کر دیتا، اس کے جسم پر ہاتھ پھیرتا۔ یہ عمل گھر میں بھی جاری رہتا۔ دفتر میں بھی، راہ چلتے بھی۔ جب کبھی اس کو کوئی عجیب بات چونکاتی وہ جلدی جلدی نیلو کے جسم کو ننگا کرنے لگتا اور یوں اُسے راحت نصیب ہوتی۔

ٹھیک ہے، بس یہی طریقۂ کار ہے، جس کے باعث ذہن اذیتوں سے
نجات حاصل کر سکتا ہے، اس نے اطمینان محسوس کیا، رفتہ رفتہ اس کا ذہن
شگفتہ ہونے لگا اور رات کو گہری نیند آنے لگی، خوب گہری اور پیاری نیند۔
یہی وہ چاہتا تھا۔ سوچ سوچ کر گھلنے سے کیا حاصل۔ ساری دنیا خوش ہ
ہر آدمی اپنے کام کے بعد اپنے بیوی بچوں میں، یار دوستوں میں خوش رہتا ہے۔
اس سے کم تنخواہ پانے والا بھی، بلکہ بہت غریب بھی، جن میں اکثر کو فاقے
نصیب ہوتے ہیں۔ وہ بھی مزے میں رہتے ہیں۔ جلنے سے کیا فائدہ۔ ہاں جلنے
سے کیا فائدہ؟؟........

لیکن انھیں دنوں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ یا پھر یہ کہ یہ واقعہ تو بہت
معمولی تھا مگر اس نے اُسے بہت اہمیت دے دی۔ اس فیصلہ کے بعد بھی کہ وہ
آئندہ بڑی سے بڑی بات کو بھی کم سے کم اہمیت دے گا۔ یوں بظاہر بہت
چھوٹی سی بات تھی۔ شہر کے چوک میں جو چلڈرن پارک ہے، اس کے بیچوں بیچ
چبوترے پر لمبے سے پول سے جھنڈا لہرایا کرتا تھا۔ ایک دن پھریرے کا کنارہ کچھ
سُرخ سُرخ نظر آیا۔ چند آدمی غور سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سُرخی کہاں سے آئی،
یہ سُرخی کہاں سے آئی۔ پھریرے کا کنارہ لہو سے تر ہو گیا تھا —— دفعتاً
وہ چونک اُٹھا۔ "لہو سے کیسے تر ہو گیا؟" وہ آگے بڑھا اور چبوترے پر کھڑا
ہو گیا۔ جس کے درمیان جھنڈے کا پول گڑا تھا۔ واقعی لہو تھا، جیتا جیتا لہو۔
وہ محویت اور خوف سے دیکھ رہا تھا۔ دیکھ تو اور لوگ بھی رہے تھے مگر ان کے
چہروں پر کسی کا خوف، کسی طرح کا تردد نہیں تھا۔ یوں ہی تماش بینوں والی

کیفیت تھی۔

کیا بات ہو سکتی ہے؟" ایک شخص نے پاس کھڑے ایک آدمی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار، کوئی زخمی پرندہ اُڑتا اُڑتا پھریرے سے اُلجھ گیا ہو گا۔"

لیکن وہ سراسیمہ تھا۔ وہ ابھی جھنڈے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا کہ ٹپ سے ایک قطرہ اس کی ناک کے پاس گرا ـــــ دھک سے اس کا کلیجہ اُچھل گیا۔ وہ بڑبڑا کر چبوترے سے اُتر آیا۔ اس کا دل دھک دھک، بے تحاشا دھڑکے جا رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر کچھ نہیں دیکھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس نے گھر کی راہ لی، جیسے کوئی اس کو رگیدے چلا آ رہا ہو۔ اس نے پتہ نہیں کس خوف کے زیر اثر پلٹ کر دیکھا، کوئی نہیں، وہ صرف دُم کٹا کتا تھا، حسب دستور اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ جتنا تیز چل رہا تھا، اتنی ہی تیز کتے کی بھی رفتار تھی۔ اس نے ایسا محسوس کیا، اس نے غور کیا کہ ابھی اس نے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا کہ کوئی اور اس کا تعاقب تو نہیں کر رہا ہے۔ اس وقت اسی انہماک سے کتے نے بھی مڑ کر دیکھا تھا۔

لیکن پھر اس کے دماغ میں خون میں لتھڑے ہوئے پھریرے کا کنارہ چمک اُٹھا، اس کا دل پھر بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ چنانچہ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا گویا پناہ کی تلاش میں اپنے گھر میں داخل ہوا اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ وہ دُم کٹا کتا وہیں باہر دہلیز پر بیٹھ گیا...... ذرا دیر بعد حسب معمول اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو خلاف توقع کتے کو پھر دہلیز پر بیٹھے دیکھ کر اسے نہ تعجب ہوا نہ اُلجھن، نہ خوف، نہ اطمینان...... نہ سکون، بس کوئی چیز تھی جو اس کے

اندر کی دنیا میں پھیلتی جا رہی تھیں..... مگر اس نے پھر دروازہ بند کر لیا اور ذرا دیر خاموشی سے کھڑا رہا۔

اس کی بیوی کھڑی اس کی بدحواسی کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ جب وہ آنگن پار کر کے اس کے قریب آیا تو اس نے راستہ روک لیا۔ "کیا ہوا، ایسے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"کون ہو تم...... بتاؤ نیلو کہاں ہے؟" وہ غور سے نیلو کے چہرے کو تکتا رہا۔

"ارے کیا ہو گیا آپ کو؟" اس کی بیوی نے حیرت سے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نہیں پہچان رہے ہیں؟ میں نیلو ہی تو ہوں۔"

"ارے..... ہاں وہ سنبھل گیا، اپنے حواسوں میں آ گیا۔ "معاف کرنا نیلو، میں نے دیکھا نہیں۔"

"دیکھا نہیں!" اس کی بیوی نے تعجب سے کہا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے....

"کچھ نہیں، چھوڑو اس بات کو۔ اس نے نیلو کی کمر میں بازو حمائل کر دیا۔ اور اندر کی طرف لے چلا۔ "چلو تمھیں آج ایک دل چسپ اور حیرت انگیز بات سنائیں۔"

اس نے ضبط کیا، جذبات کا اور سراسیمگی کا ریلا جو اُسے بہائے لئے چلا جا رہا تھا، اس نے اس پر قابو پا لیا۔ پھر اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اس واقعہ کو وہ نہایت نارمل ڈھنگ سے نیلو کو سنائے گا۔ یوں کہ نیلو سن کر اسے بے وقوف نہ بنائے۔

"کیا بات ہے، بتائیے؟" نیلو کمرے میں آ کر بولی۔ "مگر ٹھہریئے۔ پہلے آپ منھ

ہاتھ دھو لیجئے۔ اتنی دیر میں میں چائے بنا لیتی ہوں۔"

واقعہ سن کر نیلو نے کوئی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ معمولی سی بات ہے، کوئی زخمی پرندہ گزر رہا ہو گا۔ پھر یہ سے الجھ گیا، بس ــــــ

اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" نیلو نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور ذرا دبوچ کر پیار دے لیا۔

" اس میں حیرت کی کچھ بات ہی نہیں ہے۔؟؟" اس نے نیلو کو زور سے جھٹک دیا۔" چل پرے ہو۔ تم کو نیلو ہر وقت ...... آٹھ سال شادی کو ہو گئے، جلتے دُنیا پر کیسی بربادی آنے والی ہے اور تم ہو کہ تمھارے دماغ میں ایک ہی بات....!"

نیلو، اس کی بیوی چکرا گئی، یہ سن کر ذلت اور کمتری کے احساس نے اُسے رُلا دیا۔ وہ دانت پیستی، روتی اور بدبداتی دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن اُس کو ذرا ندامت نہیں ہوئی۔ اس کی بیوی، خوب صورت اور محبت کرنے والی بیوی اس سے روٹھ کر چلی گئی، اس نے ذرا سی بات پر نیلو کو ذلیل کر دیا لیکن اُسے ذرا شرمندگی نہیں ہوئی۔

رات کو اس کے کمرے میں نیلو نہیں آئی۔ دوسرے کمرے میں اندر سے دروازہ بند کر کے سوتی رہی اور سسکیاں لے لے کر روتی رہی مگر اس کو ذرا احساس نہیں ہوا۔ آج تو اس کا ذہن بُری طرح پراگندہ تھا۔ وہ چارپائی پر خاموش پڑا چھت کی طرف تک رہا تھا اور اُس کا دل خوف اور مایوسیوں تلے نڈھال سا تھا۔ جیسے کسی گہرے سیاہ سمندر کی تہہ کے نیچے وہ چپ چاپ پڑا ہو اور اُس کے اوپر سے ہیبت ناک موجیں گزر رہی ہوں۔ بڑے بڑے آبی پرندے، جن کی آنکھیں

آنکھیں گول گول اور بشرے ہنستے ہوئے سے ہیں۔

خوف سے، آنے والے کل کے خوف سے اس کا دل دھڑک دھڑک کر رک رک جاتا۔ پھر اس نے شدت سے آنکھیں میچ لیں اور بڑی کوششوں کے بعد اپنے آپ کو کالے سمندر کی تہہ سے ابھارا، اور نیلو کے خوب صورت جسم کی تابندگی کو تصور ہی تصور میں جگاتا رہا۔ اور یوں اس نے آپ پر احسان کیا کہ اس کا وجود ہلکا پڑ جائے۔ اس کے دل پر جو بھاری بوجھ سا ہے، وہ ہلکا ہو، آنکھوں میں نیند کی پریاں بسیرا لیں۔ رات بیت گئی۔ باہر اور اندر ہر طرف سناٹا مسلط تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا......

اس نے پلٹ کر دیکھا، کمرہ خالی تھا۔ دیواریں بڑی گہری چپ سادھے کھڑی کھڑی تھیں، آج ...... آج نیلو بھی نہیں تھی، دوسرے کمرے میں روتی روتی سو چکی تھی۔

پھر کہیں سے سنسناتا ہوا سمندر اس کے وجود کے اوپر سے گزرنے لگا۔ بڑی ہیبت ناک موجیں اس کو روندتی رہیں اور کوئی آبی مکروہ پرندہ......

دفعتاً اس کی آنکھ کھل گئی، بڑا گہرا اندھیرا تھا، اندر کھڑکی سے چاند کی ہلکی سی روشنی داخل ہو رہی تھی...... اس نے کھڑکی کی جانب غور سے دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ کیا دیکھ رہا تھا، اس کی چھٹی حس کو کسی شے کی تلاش تھی؟

اس کے اپنے سوالوں کے جواب دیتا؟ وہ خود سے سوال کرتا، اس نے آنکھیں بند کر لیں، گہرا اندھیرا جس میں ٹوٹتی بکھرتی سی سفید لکیریں پپوٹے کے اندر جلدی پھیلتی، دوڑتی کودتی، شبیہہ بناتی ہوئی لکیریں...... یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟

دفعتاً اس کے کان میں وہی الفاظ؟ پھر اس نے محسوس کیا کہ جیسے سامنے والی

کھڑکی کے باہر کسی پرندے کے پر بہت دھیمے سے پھڑپھڑائے، اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ نہیں وہاں کچھ نہیں تھا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں اور تصورات کے رخ کو نیلو کے خوب صورت جسم.......... عین اسی وقت اس کے کان میں وہی الفاظ گونجے.......... مگر اس بار ذرا واضح وہی الفاظ .... وہی الفاظ

.... وہی .... وہی ....

وہ سہم گیا، اس نے پلٹ کر دیکھا تو کھڑکی پر کوئی کالی کالی چیز دھیرے دھیرے متحرک تھی .... پھر پر پھڑپھڑائے۔ پھر اس کے کانوں میں آواز آئی .... تج دو .... تج دو.......

اس نے کھڑکی پر آکر دیکھا اور جلدی سے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں .... لیکن پھر وہی آواز آئی، وہی جلتے ہوئے سُلگتے ہوئے انگارہ صفت الفاظ، اُس کی آنکھیں پھر اُدھر مُڑ گئیں، کھڑکی پر کوئی پرندہ ....

اس نے پھر آنکھیں بند کرلیں، زور سے میچ لیں۔ پھر کان میں جو انگلیاں دے رکھی تھیں انھیں سخت کرلیا۔ پھر بار بار بدحواسوں کی طرح آنکھیں کھولتا، کھڑکی کی جانب دیکھتا، کان کی انگلیاں ڈھیلی کرتا۔ سنسنی۔ .... یہ عمل بہت دیر تک جاری رہا....... تو وہ تھک گیا۔ وحشت، بے بسی سے اُس نے چاروں اور دیکھا؛ وہاں کوئی نہیں تھا، اور تب اُس کا جی بھر آیا اور وہ رو پڑا۔ وہ رو رہا تھا، اور اس کے کان بج رہے تھے۔ لگاتار

وہی منحوس الفاظ گونج رہے تھے اور جب وہ رو رہا تھا، اس نے دیکھا، وہ دُم کٹا کتّا جسے وہ دروازے کے باہر چھوڑ آیا تھا اور اندر آ کر دروازہ بند کر لیا تھا، وہ پتہ نہیں کیسے اندر آ کر اُس کے لحاف میں آ گھُسا تھا۔

اُس نے دیکھا دم کٹا کتّا، اس سے تقریباً چمٹا اس کے گال سے اپنے پھوتھنے لگانے لگا تھا اور اُس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کتّا اُس کی گردن کو ہولے ہولے چاٹ رہا تھا...... اور اس کے کان بدستور بج رہے تھے اور آنسو بہہ رہے تھے ....

اقبال متین

بیر بہوٹی

جب بٹّن کے اوسان ٹھکانے لگے تو مسٹنڈے بلودین تہمد سے ہاتھ پونچھ رہا تھا اور روشنیاں بھک بھک جل رہی تھیں —— چندھیائی ہوئی آنکھوں سے بٹّن نے دیکھا تو کوری صحنک میں جلتا ہوا عود روشنیوں پر دھواں اُچھال کر یلغار کر رہا تھا۔ اور کتنے ہی لوگ تھے جو بٹّن کو گھیرے ہوئے تھے اور پانی کے چھپاکوں کا سلسلہ ابھی ابھی ٹوٹا تھا۔ یہ بات بٹّن نے اپنے بھیگے بھیگے چہرے سے بعد میں محسوس کی۔ پہلے تو ٹھڈی سے گلے پر اُتر کر سینوں کے بیچوں بیچ جو ایک ٹھنڈی ٹھنڈی سی دھار رینگ رہی تھی اس نے بٹّن کو چونکا دیا۔

مکان کیا تھا اُجڑی اُجڑی سی ایک حویلی تھی۔ بھائیں بھائیں کرتے سناٹے چاروں طرف پھنکارتے تھے۔ جب بٹّن اپنی ممّی اور چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اس حویلی میں اُتری تھی تو بھیگی ہوئی شام کی اداسیوں نے ساری حویلی پر یوں قبضہ کر رکھا تھا جیسے کوئی دل ہی دل میں سسک رہا ہو۔ ہری کائی جمی کالی دیواروں کی

پھوار سے منہ دھو رہی تھیں لیکن لگتی تھیں کہ بوند بوند آنسوؤں میں رو رہی ہیں۔ حوض میں پانی اُتھلا اُتھلا تھا۔ فوّارہ یوں ٹوٹا تھا کہ پانی اچھل کر حوض میں گرنے سے پہلے سمنٹ کے بنے کنول پر سر پھوڑتا ہے اور ڈر ڈر کر یوں حوض میں گرتا تھا، جیسے زندگی کسی لاش کو اتارنے کے لیے قبر میں اترتی ہو۔ فرق صرف اتنا تھا کہ زندگی قبر سے باہر نکل آتی تھی لیکن ٹوٹے فوّارے کا پانی حوض ہی کا ایک حصہ ہو جاتا تھا۔ جس میں ڈھیر ساری ٹوٹے گھڑوں کی ٹھیکریاں تھیں، شیشوں کے ٹکڑے تھے، چھوٹے بڑے پتھر تھے۔ ڈوبی ہوئی کاغذ کی کشتیاں تھیں اور کتنے ہی مینڈکوں کے مردہ جسم ہاتھ پاؤں پسارے پیٹ آسمان کی طرف کیے چت پڑے سطح پر تیر رہے تھے۔ دو ایک جو زندہ تھے وہ ڈرے سہمے کونوں میں چھپتے تھے۔ کبھی کبھی ٹرٹراتے تو کہیں سے ایک پتھر یا ایک ٹھیکری تڑاق سے پانی میں آ گرتی اور ان کی ٹرٹریوں بند ہو جاتی جیسے بھائیں بھائیں کرتی حویلی کی پھنکار سے سہم گئی ہو۔

بٹّن کو یوں لگا جیسے اس گھر میں وہ ساری کیفیتیں مجسم ہیں جو پی یو سی میں ناکام ہو کر خوب خوب رونے کے بعد اس پر طاری رہتی ہیں۔ بھاری بھاری سوچ سے عاری دماغ، بوجھل بوجھل پپوٹوں کے ڈھکن، وہ بھی ایسی خالی خالی آنکھوں پر جن میں مزید رونے کے لیے کچھ نہ رہا ہو —— پھر اسے یکایک خیال آیا یہ حویلی اس کے بابا کی طرح ہے جسے ڈھا دینے کو جی کرتا ہے —— چپ چپ سی اداس اداس کوٹھی کیا کھڑی ہے ابّا کھڑے ہیں —— اور اس نے سوچا ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ —— جی اُمڈا اُمڈا کر آرہا ہے۔ بھلے سے کہیں کونے میں چھپ کر روؤں —— اور جب وہ اٹھ کر کونے میں گئی تو آنسو تھے پر آنکھوں کا راستہ بھول گئے تھے۔

عجیب سی دحشت تھی۔ کیا نام دوں بھلا اس غم کا کہیں اور چھور ہی نہیں۔
میں اتنی مردہ مردہ سی کیوں ہو گئی ——— بٹّن کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہ اس،
بات کو مان لے کہ سر پہ کھڑا امتحان دراصل ان اداسیوں کا سبب ہے۔ کوئی لٹیرا،
دل کی ساری دنیا کو تاراج کرنے والا لٹیرا، کبھی ذہن پر چھائے بادل چھٹتے تو چہرہ
دکھا جاتا لیکن یہ صورت پہچانی نہ جاتی، یہ تھا کون۔ یہ ہے کون ——— امتحان امتحان
امتحان ——— کوئی کانوں میں چلاّ جاتا ——— تم امتحان سے ڈر گئی ہو بٹّن۔

پہلے پہلے ممّی کہتی تھیں میری بٹّن ڈاکٹر بنے گی۔ پی یو سی فرسٹ ڈویژن میں
پاس کرے گی تو بٹّن کو یوں لگتا جیسے وہ ڈاکٹر بن گئی ہے اور وہ ممّی کی گردن میں باہیں
ڈال کر جھول جاتی۔ ممّی بٹّن کو خیالوں میں ڈاکٹر بنا کر چپ ہو رہتیں تو بات بھی تھی۔
لیکن وہ ہر آنے جانے والی سے کہتیں، فزکس، کیمسٹری، باٹنی، بیالوجی
میری بٹّن یہ سب پڑھ رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر بنے گی ——— تو بٹّن اِترا اِترا کر گھر بھر
گھر بھر میں یوں گھومتی پھرتی جیسے ہاسپٹل میں مریضوں کا معائنہ کرتی پھر رہی ہو۔
ساتویں جماعت میں فیل ہوئی تھی تو ممّی نے بٹّن کو مشن اسکول سے نکال لیا۔
ممّی سمجھتی تھیں کہ وہ اور اس کی بٹّن دنیا کے ہر ناممکن کام کو ممکن بنا سکتے ہیں ———
اسٹرونائٹس چاند کے پیچھے پڑے ہیں۔ ایسے چاند کے پیچھے جس میں دور دور تک
زندگی کا شائبہ نہیں ہے۔ ممّی کی بٹّن امریکہ میں پیدا ہوتی تو وہ اور بٹّن سیدھے
مرّیخ پر پرواز کرنے کے منصوبے بناتے۔ ویسے اب تو مرّیخ میں بھی کیا دھرا ہے۔ ممّی
نے کہیں سن رکھا تھا کہ کسی بڑے آدمی کی ڈکشنری میں ناممکن لفظ سرے سے
تھا ہی نہیں۔ پہلے جب اس نے یہ بات سنی تو سمجھا کہ غلطی سے چھوٹ گیا ہوگا ———

یہ بڑا آدمی کیسا بڑا آدمی تھا، جو دوسری ڈکشنری بھی نہ خرید سکتا تھا جس میں سارے لفظ ہوں ——— لیکن جب بٹّن نے اصلی بات سمجھائی تو پھر ممّی نے اپنی ڈکشنری سے بھی اس لفظ کو نکال پھینکا ——— ڈکشنری اپنی جگہ دھری گرد میں اٹی رہی۔ یہ لفظ وہاں سے نکل کر رینگتا رینگتا بٹّن کی زندگی میں داخل ہو گیا۔

اور ساتویں جماعت سے ایک دم پرائیوٹ میٹرک میں بیٹھنے والی بٹّن دوبار فیل ہو کر تیسری بار کامیاب ہو سکی۔ ممّی اتنی خوش ہوئیں کہ اس کے ڈاکٹر ہونے کا اعلان کر ڈالا۔ اس اعلان پر بٹّن پھولی نہ سماتی تھی۔ لیکن جب سائنس کی کتابیں کھلیں تو بٹّن نے محسوس کیا کہ لوہے کے چنے چبائے نہ جائیں تو تھوکے تو جا سکتے ہیں، لیکن کیمسٹری، بیالوجی نہ چبائی جاتی ہے نہ نگلی جاتی ہے۔ رہ گیا آخ تھو کر کے تھوک دینا سو اسے ممّی نے ناممکن بنا رکھا تھا۔ کہاں ممّی اس لفظ کو ڈکشنری سے نکالنے چلی تھیں کہاں اس لفظ کو بٹّن کی زندگی میں ٹانک کر رکھ دیا۔

پہلے ہی امتحان میں وہ ناکام ہو گئی۔ سوالات کے پرچے عفریت بن کر ڈراتے تھے۔ سفید سفید جوابات کی کاپیاں بٹّن کے قلم کے لمس کو ترستی تھیں اور بٹّن کے دماغ میں سرکس کے جوکر کی الٹی ٹوپیوں کی طرح اڑنے والے بگولے سائیں سائیں کرتے گھستے تھے۔ بٹّن چاہتی تھی کہ رو پڑے لیکن امتحان ہال گھر کا گوشہ تو تھا نہیں اور اسی لیے بٹّن رو نہ سکی۔ پرچہ دے کر گھر لوٹی تو ممّی نے پوچھا۔

"کیسا کیا بٹّن؟"

کہنے لگی "۔ بہت اچھا کیا ہے، بہت اچھا۔"

گھر میں چمگادڑیں اڑتی پھریں تو کیسا لگتا ہے۔ بٹّن جب ممّی سے کہہ رہی۔

تھی کہ پرچہ بہت اچھا کیا تو یوں لگا کہ سینے میں چمگادڑیں اُڑ رہی ہیں اور
ابا میاں اڑاتے پھر رہے ہیں۔ یہ ابا میاں ایک ہی منحوس آدمی ہیں۔ اُڑتی
چمگادڑیں یوں گن لیتے ہیں جیسے سب کی سب انھیں کی چھوڑی ہوئی ہیں۔

ممی نے پکارا۔ ذرا بٹن کے لیے دودھ لانا، ہارلکس لانا —— میں سب سے
پہلے رحیمن کا علاج تم سے کراؤں گی ڈاکٹر —— "دو تین گولیاں ایسی دینا کہ
اس کے جوڑوں کا درد بھری جوانی کی امنگیں بن جائے۔"

"ہاں بیٹا جلد سے جلد بن جاؤ ڈاکٹر۔ یہ امتحان کامیاب کرلوگی تو گولیاں
دوگی نا مجھے؟"

"اور سنو، ڈاکٹر بی بی۔ جرا میرا بھی خیال رکھنا۔ مفت لال ہوں۔ سو ہر
دوا مفت لوں گا ——" دروازہ میں داخل ہوتا ہوا لانڈری والا بٹن کے
دھلے اجلے کپڑے ممی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتا۔

عطو آنٹی تاک میں رہتیں۔ مکان جو سامنے ہی تھا، کھڑکی کھلتی اور بجق
ہٹا کر دو آواز دیتیں —— بٹن کی ممی —— بٹن کی ممی۔"

"ہاں آپا ——"

"وہ پلا دیا تھا نا بٹن کو؟"

"ہاں آپا پلا دیا تھا۔"

"آیت پڑھ کر پھونکی تھی نا؟"

"ہاں آپا —— پچپن بار ورد کرنے کو کہا تھا نا تم نے۔"

"کیسے کیے پرچے اس نے؟"

"بہت اچھے کیے ہیں، خوش خوش آئی ہے"۔

بٹن مسکرا مسکرا کر یہ سب سنتی لیکن کون جانتا تھا کہ بٹن مسکرا نہیں رہی ہے۔ بس سینے میں پھڑ پھڑاتی چمگادڑیں اڑا رہی ہے۔

بابا آتا ہوا نظر آتا تو بٹن جل کر رہ جاتی۔ الجھی الجھی بھٹکی بھٹکی نظریں چہروں پر ڈال کر چپکے سے گزر جانے والا بابا کچھ کہے سنے بغیر غم اور خوشی کے درمیان خطوط کھینچتا پھرتا تھا۔ بٹن مسکرانا بھول جاتی تھی۔ اس کو وحشت سی ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مسکرائے گی تو بابا چیخ پڑے گا۔

مسکرا رہی ہو بٹن کہ زخموں پر نمک چھڑک رہی ہو۔

اور وہ منہ پھیر لیتی۔ کتنی چمگادڑیں بابا ہنکاتا ہوا لاتا اور سب کی سب بٹن کے سینے میں چھپ جاتیں۔ اس لیے کہ بٹن کے سینے میں بہت زیادہ اندھیرا ہوتا اور وہ ٹھو کا لگا کر اپنی امی سے کہتی —— "ممی ممی، بابا آرہے ہیں"۔

"تو آنے دے —— پچپن بار تو کیا ہے۔ ایک سو پچیس بار آیتیں ورد کر کے پھونکوں گی۔ خدا کا کلام ہے۔ کچھ ان کا الٹا سیدھا لکھا تو ہے نہیں"۔

"وہ تو پھونک لینا ممی —— پر وہ اگر پوچھیں گے کہ پرچے کیسے کیے تو پھر میں کیا کہوں؟"

بٹن کو اپنی کہی ہوئی بات کا فوراً احساس ہو جاتا۔ جب وہ مطمئن ہے جب اس نے پرچے اچھے کیے ہیں تو اس میں ممی سے پوچھنے کی کیا بات ہے۔

"کیسے کیے پرچے بٹن؟"

بٹن کو یوں لگتا جیسے بابا کہہ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے پرچے خراب

کئے ہیں۔ وہ بے دلی سے ٹال جاتی ــــ ٹھیک ہی کیے ہیں"۔

ٹھیک ویک نہیں، بہت اچھے کیے ہیں ــــ کہتی کیوں نہیں رانڈ۔ ممی اس طرح بجلی بن کر گرتی کہ سارے میں آگ لگ جاتی۔

بابا دبی زبان میں کہتا ــــ "تم بگڑو مت بھئی ــــ بہت اچھے پرچے کر کے کم بتلانا دانش مندی ہے"۔

اجی چھوڑیے بھی یہ دانش مندی کسی اور کو سکھائیے ــــ وہ دراصل آپ سے گھبراتی ہے۔ آپ کو دنیا بھر کی باتوں کا تو یقین آتا ہے لیکن جھوٹی ہے تو بٹّن ہے ــــ جھوٹی ہوں تو میں ہوں۔ آپ ہماری بات پر یقین کب کرتے ہیں۔ اب وہ کیا خاک بتلائے گی کہ اس نے بہت اچھے پرچے کیے ہیں۔ اچھے پرچے تو آپ کے خاندان کی لڑکیاں ہی کرتی ہیں"۔

بابا کھڑا مِٹ مِٹ کبھی بٹّن کا، کبھی ممی کا چہرہ تکتا۔ یوں لگتا جیسے اُس کی آنکھوں میں کوئی سمندر رکھا ہے جو اُبل پڑے گا تو سب کو لے ڈوبے گا۔

بٹّن کو بابا کے اِس ہارے ہوئے وجود سے گھِن آتی اور وہ ممّی کے زانو پر سر رکھ آنکھیں موند لیتی۔

بابا کچھ کہے سنے بغیر لوٹ جاتا اور بٹّن اسے واپس جاتا ہوا دیکھ کر ممی سے چمٹ جاتی۔

بابا کتنا خطرناک آدمی ہے بٹّن سوچتی۔ مستقبل کی یوں نشان دہی کرتا ہے جیسے ہماری ہتھیلیوں کی لکیریں اسی کے قلم کی رہینِ منّت ہیں ــــ کھڑا کھڑا چپ چپ سا، یوں دور دور تک دیکھتا جیسے آنے والے دنوں کو دیکھ رہا ہو۔

جی چاہتا ہے اس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔
بیر بہوٹی کو چھو لیں تو کس طرح پیر سکیڑ لیتی ہے۔ کسی لمس سے واسطہ نہیں۔ چھونے والے انسانی ہاتھ ہوں یا سوکھے ڈنٹھل۔

بٹن سوچتی میری روح بیر بہوٹی کی طرح پیر سکیڑ کر کہیں میرے اندر ہی بیٹھ گئی ہے۔ اس روح کو بابا نے پہلی بار اس وقت چھوا تھا جب میں ساتویں جماعت میں فیل ہوئی تھی۔ لیکن ممی آڑے آئیں۔ اور مجھے ایک دم سے میٹرک میں بٹھا دیا ——— کیسا اچھا لگتا تھا جب میں اپنی سہیلیوں سے کہتی تھی۔ میں میٹرک میں پڑھتی ہوں۔

ممی کہتیں ——— "بٹن تو میٹرک کا امتحان دے رہی ہے"۔
اماں میری ——— "اتنی سی جان اور میٹرک کا امتحان"۔
کوئی کہتا ——— "تو میٹرک کا امتحان دے گی بٹیا"؟

مجھے لگتا ممی کیسی پیاری سی ہیں۔ کیسی میری اہمیت خاندان بھر میں بنا کر رکھ دی ——— بابا نے بہت سر پیٹا کہ میں اپنے اسکول سے نہ نکلوں، اسی کلاس میں پڑھوں جس میں فیل ہوئی ہوں، لیکن ممی نے وہ آڑے ہاتھوں بابا کو لیا کہ اس کی ایک نہ چلنے دی اور وہ بھی بیر بہوٹی بن بیٹھا، مجھے کتنی خوشی ہوئی، لیکن پاؤں سکیڑ کر چپ رہتے رہتے بابا نے ایک کمینہ پن یہ کیا کہ میرے مستقبل کے بارے میں بغیر زائچہ دیکھے بہت کچھ کہہ گیا۔ ممی لیکن اس سے ڈری نہیں۔ ممی تو بابا کی ہر بات کو چیلنج سمجھ کر قبول کر لیتی تھی۔ وہ گھگھیا جاتا تھا۔ پھر بیر بہوٹی بن جاتا تھا ——— اور میں ——— میں تو دل ہی دل میں تالیاں بجاتی تھی۔

جی چاہتا تھا چلا کر کہہ دوں ـــــ دیکھو دیکھو یہ بابا ہے یا بیر بہوٹی۔
لیکن دن گزرتے گئے تو میں سوچنے لگی ـــــ یہ بابا بیر بہوٹی تھا یا کاتبِ تقدیر تھا۔ اور میری روح میں کوئی چیز تیزی سے سکڑ گئی ـــــ اور بابا آہستہ آہستہ میری تعلیم سے بے تعلق ہوتا گیا۔ ممی جو چاہے کرتی رہیں۔ کون کہتا ہے کہ اس نے میرے لیے بُرا کیا ـــــ ایک دن ممی نے کسی کتاب میں پڑھا تھا۔ "سچ برداشت نہیں ہوتا ہے۔" وہ پڑھ رہی تھیں۔ میں سن رہی تھی۔ جانے کیوں میرا خیال بابا کی طرف چلا گیا۔

اور جب ممی نے آگے پڑھا کہ سچ کبھی مر نہیں سکتا ـــــ تو میں نے کتاب جھپٹ لی اور پھینک دی۔ ممی نے برہم ہو کر مجھے دیکھا ـــــ میں اس سے لپٹ کر ہنستی رہی۔

میں کیسے پوچھ سکتی تھی کہ ـــ کہ ـــ کیا بابا کبھی نہیں مر سکتا تھا۔

بٹن یوں ہی اندر سے ٹوٹتی رہتی، کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ـــــ ممی کے زانو پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو لے اور پھر آہستہ سے اس سے کہہ دے ممی بابا ٹھیک ہی کہتا ہے، ہم کیوں ضد کریں ـــــ میٹرک میں میں نے سائنس نہیں پڑھی۔ اب پی یو سی میں یہ لوہے کے چنے مجھ سے چبیں گے نہیں لیکن میں جانتی تھی امی ہارنے والی نہیں ہیں۔ یہ ان کی پرسٹیج کا مسئلہ ہے، اور ان کی پرسٹیج میری اپنی پرسٹیج ہے۔ بابا کہتا ہے بٹن کی ممی تم ہر بات میں ضد کیوں کرتی ہو۔ اس میں بھلا ضد کی کیا بات ہے۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے تو بُرا کیا ہے۔ بابا کہتا ہے ہم خود فریبی میں کیوں مبتلا رہیں۔ وہ دھوکا جو آدمی خود کو دے لیتا ہے سب سے خطرناک دھوکا ہے۔ واقعی ہم کو اس مسئلہ کو

اپنی پرسٹیج کا مسئلہ کیوں بنائیں، لیکن بعض وقت آدمی خود کو دھوکہ نہ دے لے تو زندہ رہنا دشوار نظر آتا ہے۔

"جی ہاں ہم دھوکے باز ہیں، جھوٹے ہیں، خطرناک ہیں ——" بابا کی کہی بات پر ممی کا ردِ عمل توانائی بخشتا —— لیکن جب بٹّن دوسرے سال بھی فیل ہو گئی تو بابا اس طرح خاموش تھا جیسے وہ سب کچھ جانتا تھا —— جیسے پرچے اسی نے سٹ کیے تھے، اسی نے جانچے تھے اور اسی نے فیل کیا تھا۔

اور اب تو مسٹنڈا بلّو دین تہمد سے ہاتھ پونچھ رہا تھا، روشنیاں بھکا بھک جل رہی تھیں، کوئی صحنک میں عود جل رہا تھا اور بٹّن کو تیسری بار امتحان میں شریک ہونا تھا اور بلّو دین کہہ رہا تھا —— میں نے گرفت کر دی ہے اس کے حدود متعیّن کر دیے ہیں، شیخ سدو بڑا بد ہوتا ہے، نہایت خبیث بڑی مشکل سے قابو میں آتا ہے۔"

بٹّن سوچنے لگی، مجھے تماشہ بنانے والوں کے منہ پر ایک چانٹا جڑ کر چلانے لگوں کہ اندھو —— وہ شیخ سدّو نہیں ہے —— وہ میں خود ہوں۔ مجھے خود مجھ سے کیسے جدا کرو گے لیکن یہ ساری باتیں کہنے کی نہیں تھیں۔

بٹّن، اس کی امّی، اس کے بابا جب حویلی میں اٹھ آئے تھے تو اپنی ضروریات کے مطابق دو کمرے انھوں نے لے رکھے تھے۔ لیوٹری سے متصل ایک کمرہ بند پڑا تھا اور ساری حویلی تو سدا کی بند تھی۔ دور دور تک دیواروں پر ویرانی تھی۔ چھتوں پر مکڑیوں کے اتنے جالے تھے کہ بٹّن کو صفائی کے خیال ہی سے وحشت ہوتی تھی۔ بانس کو جھاڑو لگا کر اس نے ہلایا نہیں کہ مکڑیاں کود پڑیں گی۔ اس کے کانوں میں، ناک میں، آنکھوں میں مکڑیاں، مکڑیوں کے جالے اور دیکھتے ہی دیکھتے کوئی شخص اس کے

سامنے کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں، ناک میں، کانوں میں، بالوں میں مکڑیاں ہی مکڑیاں تھیں، ان کے جالے تھے اور اس شخص کا چہرہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ بٹن نے غور سے تصور میں لائے ہوئے اس آدمی کو دیکھا، پہچاننے کی کوشش کی لیکن چہرہ ذرا سی جھلک دکھا کر کہیں چھپ جاتا تھا۔

"یہ تو تمھاری ممّی ہیں۔"

"نہیں نہیں تم خود ہو۔"

بٹن نے زور لگا کر جب تصور میں آئے ہوئے ان دونوں چہروں کو ہٹا دیا اور مکڑیوں سمیت چہرے پر سے ان کے جالے نوچ پھینکے تو علانیہ بابا کھڑا تھا۔ بٹن کو کیسا سکون ہوا، یہ سوائے بابا کے اور کون ہو سکتا ہے۔

سارا دلدّر بابا کے ساتھ چلتا ہے، کائی جمی دیواریں، مردہ چت پڑے مینڈک، بھٹکتی چمگادڑیں، جالوں میں لپٹی مکڑیاں، بابا چلتا پھرتا کھنڈر ہے، ہلتا جھولتا ویرانہ، ـــــ اب ہم ماں بیٹیاں اس ویرانے کو کیا بسائیں گی ـــــ وہ ننھے ہیں جو چیخ چیخ کر اپنی آوازیں سارے میں پھینکتے پھرتے ہیں۔ ورنہ ایسے ویرانے میں جینا دشوار ہو جاتا ہے۔

بٹن کرید کرید کر اس ویرانی کو جو اس کی روح کے گھورے میں چھپی پڑی تھی نکال لاتی اور اسے باہر کی ویرانیوں میں پھینک کر سکون کی تلاش میں نکل جاتی۔ ان سب باتوں کا امتحان سے کیا تعلق ہے۔ بٹن سوچتی یہ امتحان بیچ میں کس طرح آ جاتا ہے۔ پرسوں رکشا میں جاتے ہوئے جب میں نے جنازہ دیکھا تھا تو مجھے سر پر کھڑا امتحان یاد آیا۔ ادھر میں "اِنّا لِلّٰہِ واِنّا اِلَیہِ راجِعُون" تک پڑھنا بھول گئی ـــــ کھڑکی کے سامنے کوڑے کی

ڈھیر پر مریل سورنی کے چھ سات بچے چپ اس کی سوکھی چھاتیاں چچوڑ رہے تھے تو مجھے امتحان کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی ——— وہ مہر دین حوض کا پانی نرخرے تک پہنچا کر جب بکرا ذبح کرنے لگا تو میری نظریں ذبح ہوتے بکرے کی پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پڑیں۔ مجھے خیال آیا یہ آنکھیں تو میری ہیں۔ پھر میں نے توبہ کی، اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے ہمیں بہنوں سے اچھا رکھا۔ لیکن میرا جی کہہ رہا تھا، امتحان سے تو اس طرح ذبح ہو جانا بہتر ہے۔ اللہ میں کیا کروں۔

اس دن بھی بٹّن روز کی طرح مُردہ مُردہ سی تھی، دن گزرتا تو شام ہوتی اور رات ڈھلتی تو دن۔ یہ بات تو کوئی نئی بات تھی نہیں۔ ہر ایک جانتا تھا لیکن بٹّن کی طرح دن رات کو اتنی اہمیت دینا کہ جیسے انھیں تکتے نہ رہیں تو پہچان مشکل ہو گی، کس کے بس میں تھا۔

اور سرِ شام جب بٹّن نہا دھو کر نکلی تھی تو بھی اخباروں کی ان خبروں کا بوجھ اس کے ذہن پر جوں کا توں تھا جو صبح میں اس نے پڑھی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ایمرجنسی نے سارے الٹے سیدھے ایجی ٹیٹشن خالی خولی دماغوں کے ڈبّوں میں بند کروا کے رکھ دئے ہیں، بلوے، ہنگامے، جو بغض و عناد کا اشتہار تھے اب تاریک اور ویران سینوں میں سکڑے سمٹے اپنی موت مر رہے ہیں۔ لوگ چلتے ہوئے ادھر میناروں پر کھڑے چلاتے نہیں ہیں۔ خاموشی سے کام کرتے ہیں۔ کیسی کایا پلٹ ہے۔ ایسا سکون کبھی دیکھا ہی نہ تھا، اللہ بچائے، اب کالج بھی چلے گا، امتحان بھی ہوگا، پھر میں کیا کروں گی، بہت دن پہلے بھی تو ایسا کچھ ہوا تھا۔ ایک ایجی ٹیٹشن تلنگانہ بغل میں دبا کر راجمندری میں جا گھسا تھا۔ اور برہماچی تالیاں بجا بجا کر سڑکوں پر ناچنے لگے تھے اور طالب علم گردن جھکا جھکا کر کتابوں میں الفاظ ڈھونڈنے لگے تھے اور بٹّن نے جب اپنے گیلے کھلے بالوں کو باندھنا

چاہا تو اس پر غشی طاری ہو گئی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ سنبھلنا چاہتی تھی لیکن دیوار کسی نے وہاں سے ہٹالی اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گئی تو دھڑاک سے دروازہ کھلا اور ممی بھاگیں اور چلانے لگیں —— میری بچی میری بچی۔

اب وہ زمانہ کیا ہوا، وہ بھی دن تھے جیسے زندگی سڑکوں پر بکھری بکھری بھاگ رہی ہو، چرمر کی آواز آتی تو سڑکوں کے ٹوٹے بلب، دکانوں کے ٹوٹے شیشے کانوں میں چرمراتے اور آنکھوں میں دھنس جاتے تھے۔ اب تو تلوے بھی زخمی نہیں ہوتے۔

ایک رات بٹن نیند سے چیختی ہوئی اٹھی —— ”مجھے بچاؤ، وہ مجھے کہیں لے جا رہے ہیں میں نہیں جاؤں گی ممی، میں نہیں جاؤں گی۔“

بابا نے اپنے کمرے سے دیوانوں کی طرح بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے دیکھا بٹن اسے پاگلوں کی طرح تک رہی ہے۔ کتنی وحشت تھی ان آنکھوں میں۔ اور ممی بے چاری آیتیں پڑھتی جا رہی تھیں اور بٹن کے سینے پر پھونکتی جا رہی تھیں، کچھ دیر بعد جب بٹن نے بے ہوشی اور ہوش کے ملے جلے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا تو اس نے کہا ممی، وہ کالا بلاّ نہیں کھڑکی میں بیٹھا مجھے تک رہا تھا، پھر بڑا ہوتا گیا ممی، اور اتنا بڑا ہو گیا کہ اپنا السیشین اس کے پیچھے چھپ گیا۔ پھر وہ بلاّ میری طرف بڑھنے لگا۔ اپنا پولی دم دبا کر تخت کے نیچے جا چھپا، بھونکنا بھول گیا تھا وہ۔ وہ بلاّ کتنا کالا تھا ممی۔ ممی وہ جھپٹ کر میرے بہت قریب آ گیا تھا۔ جب تم نے مجھے سینے سے لگا کر کہا کہ بٹن تو نے کوئی اُلٹا سیدھا خواب دیکھ لیا ہے بیٹی یہاں کوئی نہیں ہے کہ اتنے میں بابا آ گیا۔

ممی، یہ بابا اپنے ساتھ چمگادڑیں، مُردہ مینڈکیاں، بیر بہوٹیاں، مکڑیاں، در ان کے جالے یہ سب کچھ لیے لیے کیوں پھرتا ہے۔ اس سے کہہ دو کہ کالا بلّا بھی اگر یہاں وہی لے آیا ہے تو خدارا اسے کہیں اور چھوڑ آئے۔ ممّی ہم اپنے ہی کسی جھوٹ کی سزا تو نہیں پا رہے ہیں۔ میں ڈر گئی تھی تو بابا اپنے کمرے سے کیسے چلا آیا۔ اُس کو کیا خبر کہ میں ڈر گئی ہوں۔ اور جب بابا آیا ہے تو وہ بلّا اس کے قدموں میں لوٹ رہا تھا۔ پھر وہ اس کے قدموں ہی میں کہیں غائب ہو گیا۔ لیکن ممّی یہ جو سینے پر ایک بھاری پتھر سا ہم نے رکھ لیا ہے اس کو سرکانے کے لیے تو بابا نے بہتیرا زور لگایا تھا لیکن اس کی ایک نہ چلی تو پھر وہ، چمگادڑیں اور مکڑیاں وغیرہ لے آیا۔ ہم نے اس کے ساتھ سلوک بھی اچھا نہیں کیا ممّی ——— جب وہ ہمارے سینے پر دھری پتھر کی سِل دیکھتے کے دیکھتے استحان بن گئی ——— اور امتحان کو لے اڑے۔ ایجی ٹیشن، اسٹرائک اور کیا کیا الم غلم۔ میں کیسی چین کی نیند سوتی تھی ممّی، شہر بھر میں گولیاں چلتی تھیں۔ طالب علم مرتے تھے لیکن میں چین کی نیند سوتی تھی۔ یہ کوٹھی اتنی ویران نہ تھی۔ جب ———

اب چاروں طرف امن ہے، کوئی بھی نہیں مرتا، لوگ بازاروں میں گھومتے ہیں۔ تفریح گاہوں میں، سینما ہالوں میں، ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ زندگی اسی طرح چلتی رہی تو کالج وقت پر کھلیں گے بھی، وقت پر بند بھی ہوں گے پھر اپنا کیا ہو گا۔ اور بٹن قہقہہ مار کر ہنسنے لگتی، کیسی وحشت تھی اس کی آنکھوں میں، کیسی وحشت۔

——— اور جب ممّی نے گیارہ نام پڑھے، آیت الکرسی پڑھی تو پھر وہ نڈھال ہو کر ممی کی گود میں ڈھیر ہو گئی۔

دوسرے دن ڈاکٹر مایا نے کہا "ہسٹریائی فٹس ہیں۔"

ممی نے کھُلے بندوں اعلان کر دیا کہ ہسٹریا وسٹریا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھائیں بھائیں کرتی منحوس حویلی چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ دایہ سچ ہی کہتی تھی، اس دھوبن نے بھی تو بتایا تھا کہ یہاں روحیں فرغل پہن کر منڈلاتی ہیں، اور میرے بچے، راہ چلتے لوگ جنھیں نظر لگتے ہیں، میری بٹن جب ڈاکٹر بنے گی تو ایسی اوٹ پٹانگ تشخیص نہیں کرے گی ــــــ اٹھا کر کہہ دیا آسانی سے کہ ہسٹریا ہے۔ واہ بھئی

بٹن دن بھر کیسی نڈھال سی رہی۔

بابا نے سر پر ہاتھ پھیر کر جب اسے سمجھانا چاہا کہ بیٹا، کوئی خوف ہے جو تیرے دل میں کہیں بس گیا ہے، اسے نکال پھینک۔ تو سائنس پڑھتی ہے۔ اسپوٹنک ایج میں جب کہ آدمی چاند پر جا چکا ہے' یہ بدروحیں، یہ شیاطین بھلا کس پر رعب جما سکیں گے، سو بے چارے اپنی موت آپ مر گئے ہیں۔ جب ان سے ڈرنے والا ہی کوئی نہیں رہا تو وہ خاک جئیں گے۔ جہاں سائنس نے ترقی کی شیطان مرا بے چارہ۔

ممی بیچ میں کود پڑیں۔

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہسٹریا ہی ہے۔ میں تو کہوں گی کہ جن ملکوں نے سائنس میں ترقی کی ہے وہاں سے نکلے ہوئے شیطان بھی ہندوستان میں آبسے ہیں اور پھر کتابوں میں آیا ہے لوگوں کو بدروحیں تنگ کریں گی۔ شیاطین راستہ بھٹکا دیں گے۔

ممی جب میدان میں آئیں تو بابا کی گھگھی بندھ گئی ــــــ بہ مشکل اتنا

اتنا کہا کہ بٹّن کو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ ہسٹریا نہ سایہ سپیٹ ــــــ وہ کچھ اندر سے ٹوٹ سی گئی ہے، میری بات مانو تو۔

"میری بات" ممّی نے میدان میں جنگ کا اعلان کر ہی دیا ــــــ ڈاکٹروں کی ڈاکٹری سچی نہیں، کتابوں کا لکھا سچّا نہیں۔ بٹّن کو کچھ بھی نہیں ہے؛ وہ تو ڈھونگ رچا رہی ہے۔ اب آپ ہی کا علاج کیوں نہ کریں، نئی بیماری جو بتلادی آپ نے، اندر سے ٹوٹ رہی ہے ــــــ وہ کوئی چینی کی گڑیا ہے جو اندر سے یا باہر سے ٹوٹے گی ــــــ خود ڈاکٹر بن رہی ہے، سب جان جائے گی۔"

کھڑکی سے تیز ہوا کا جھونکا آیا تو پاس پڑی ہوئی فزکس کی بوسیدہ کتاب سے دو چار ورق لے اُڑا۔

بٹّن نے کتاب کے ورق اڑتے دیکھے تو منہ پھیر لیا۔

بابا نے کن انکھیوں سے بٹّن کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھرے بغیر اس کی ممّی کو اِدھر اُدھر کی دوسری باتوں میں لگائے رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

قاضی عبدالستار

کھاکھا

وہ دونوں طرف دور تک پھیلی ہوئی کچی دیواروں کے درمیان کھڑے ہوئے سیاہ بوڑھے پھاٹک کی قدآدم کھڑکی میں سفید داونی باندھے کھڑی تھیں جیسے دیہاتی مدرسہ کا کوئی لائق طالب علم اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھا تختی پر سفیدے سے بنی تصویر دکھلا رہا ہو۔ سڑک چل رہی تھی لیکن کوئی ان کی طرف نگاہ اٹھانے کی جسارت نہ کرتا۔ پینتیس سال گزر گئے لیکن آج بھی جب کبھی بے قرار تخیل یادوں کے کباڑ خانے میں الٹ پلٹ کرتا ہے تو کہیں سے وہ تصویر نکل آتی ہے اور تصویروں کے روایتی حسن کے پیمانوں سے چھلک جاتی ہے۔ اعداد و شمار ان کی زندگی کی کہانی پر پھبتی معلوم ہوئے۔ سولہ برس کی عمر میں باپ مرگئے۔ سترہ برس کی ہوئیں تو شادی کردی گئی۔ اٹھارہویں سال میں تھیں کہ ماں بن گئیں۔ انیس برس کی ہوئی تھیں کہ بیوہ ہوگئیں اور بیس تک پہنچتے پہنچتے گوکھ اجڑ گئی۔ اب پچھتر برس کا سن

تھا، لیکن صورت دیکھ کر اچھا بھلا ریاضی داں چالیس پچاس کے آگے گنتی بھول جائے۔ چھوٹا قد، چڑھی غلیل کی طرح کھنچا جسم، چندن سا سفید رنگ، تلچوری بال، کھڑی ناک، پاس پاس بیٹھے ہوئے ابرو، بڑی بڑی آنکھوں کے کافوریں تیرتی ہوئی سرمئی سرمئی سی پتلیاں برف سے سفید موٹی تنزیب کے دوپٹے کی داوَنی باندھے اسی کے کرتے پر خوب کلف کیا ہوا لٹھے کا فرشی پاجامہ پہنے سیاہ چمک دار اور کلکتیا جوتیاں پیروں میں ڈالے جب میرے گھر کی ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے پر طلوع ہوتیں تو بڑی بڑی مغرور بیبیاں سب کام کاج چھوڑ چھاڑ الٹی سیدھی بھاگتیں، اپنے ہاتھ سے پلنگ صاف کرتیں جیسے وہ کسی غریب عزیز کے بیٹے کی شادی نیوتے کی طرح بڑے احسانوں سے قبول کرتیں۔ عورتیں جن کے منہ چارا کاٹنے والی مشینوں کی طرح چلتے رہتے اچانک خاموش ہوجاتیں تو تڑاق کی عادی بیبیاں سرگوشیوں میں بھی کم ہی بولتیں۔ حکم احکام کے سارے معاملات ابروؤں اِدھر اُدھر ہونٹوں اور انگلیوں کی جنبشوں تک محدود ہو جاتے۔ جب تک بیٹھی بیٹھی سہمی رہتیں جیسے راجہ بھوج کی بارات گنگوا تیلی کے دروازے

میں تھا تو چھ سات سال کا...... لیکن میری ان سے لڑائی تھی میں کسی کو سلام نہیں کرتا تھا۔ نہ ماں باپ کو نہ چچا چچی کو اور نہ پھوپھا پھوپھی کو اور اگر کوئی میری شکایت میرے دادا سے کرتا کہ گھر کی، بستی کی اور علاقہ کی تمام شکایتیں انہیں کے سامنے پیش ہوتیں تو شکایت کرنے والا صلواتیں سنتا یا گالیاں کھاتا اور میں ان کے گاؤتکیے سے لگا ان کے خاصدان کے پان چبایا۔

کرتا اور شکایت کرنے والے کے زنانے یا مردانے پاجامے کے پائینچے کے قریب تھوکا کرتا لیکن جب میں نے ان کو یعنی کھا کھا کو بھی سلام نہیں کیا اور انھوں نے بابا سے میری شکایت کی تو اپنی زندگی میں پہلی بار اور مرحوم کی زندگی میں آخری بار مجھ پر ڈانٹ پڑی اور میں گھنٹوں روتا رہا۔ اور اب میں ان کو سلام تو کرتا لیکن اس طرح جیسے غلیل سے غلہ مارا جاتا ہے۔

بابا دن کا کھانا باہر اور رات کا اندر کھاتے تھے لیکن اس دن جانے کیا ہوا کہ انھوں نے عصر کے بعد کسی کو حکم دیا کہ کنیزن سے کہو ہم کھانا کھانے آرہے ہیں کہ بابا پانچ ہزار کی پوری بستی میں کسی کے یہاں شادی بیاہ کے موقعے پر بھی کھانا کھانے نہیں جاتے تھے۔ بہت مہربان ہوئے تو اس کا کھانا ۔ کبھی دسترخوان پر لگانے کی اجازت دے دی۔ تو پھر یہ کنیزن کون پیدا ہو گئیں جن کے یہاں بابا اپنے آپ مانگ کر کھانا کھانے جا رہے ہیں۔ میں مغرب کی نماز تک سوچتا رہا کہ بابا مغرب کی نماز کے بعد ہی کھانا کھانے اندر جایا کرتے تھے۔ خیر نماز ہوئی اور بابا حسب معمول اٹھے۔ میں نے ان کے بائیں ہاتھ کی باہر نکلی ہوئی شہادت کی انگلی مٹھی میں داب لی۔ ایک آدمی لالٹین لے کر آگے آگے چلا اور دو آدمی کندھوں پر لٹھ لے کر پیچھے پیچھے ہو لئے اور میرے ہوش میں پہلی بار پھاٹک کھلا جیسے آدمیوں کو کولھو میں پیلا جا رہا ہو اور وہ چیخ رہے ہوں۔ اندر لالٹین جل رہی تھی لیکن اندھیرا اندھیرا سا لگ رہا تھا۔ آدھے آنگن پر کھا کھا کھڑی تھیں۔ سر سے پاؤں تک سفید جیسے قبر سے نکلی ہوں یا آسمان سے اتری ہوں۔ جب انھوں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا تو میری ناک لوبان کی خوشبو سے بھر گئی اور

میں نے بابا کی انگلی اتنے زور سے دبائی کہ بابا نے مجھے جھک کر دیکھا اور میرے سر سے ان کا ٹھنڈا اور سفید ہاتھ ہٹا کر مجھے اپنی داہنی طرف کر لیا۔ تخت پر دسترخوان لگا ہوا تھا اور بہت سے دو بھرے پیالے چنے ہوئے تھے اور سامنے باورچی خانے میں دو عورتیں پھلکے پکا رہی تھیں اور ایک آدمی گرم گرم پھلکے لا رہا تھا۔ اور بابا ہر پھلکے کا چھلکا توڑ کر پلیٹ ہٹا دیتے اور میں کھاتے کھاتے کھا کھا کو دیکھتا تو لرز اٹھتا۔ مجھے اب یقین ہوگیا تھا کہ یہ جنات ہیں اور میرے بابا ان کے قبضے میں ہیں۔ ابھی ہاتھ دھلائے جا رہے ہیں کہ بسواں کے خمیرہ تمباکو سے مہکتا ہوا پیچوان لگا دیا گیا اور بابا تھوڑی دیر تک چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے اور پھر اچانک اٹھے اور مجھے انگلی پکڑا کر چل دئے۔

اور پھر دوسرے دن تمام بیبیاں پردہ کرا کر باہر آئیں اور رو دھو کر اپنی خطا معاف کرائی اور بابا رات کا کھانا اندر کھانے پر رضامند ہو ہی گئے لیکن اس طرح کہ کھا کھا کے یہاں سے بھی کھانا آیا اور دسترخوان پر چنا گیا اور سبھوں نے تبرک کی طرح سوارت کیا۔

لمبے چوڑے آنگن میں حد نگاہ تک سفید سفید بستر لگے تھے جیسے قبرستان کے صحن میں نئی قلعی کی ہوئی قبریں چمک رہی ہوں۔ میں درمیان کے ایک پلنگ پر مُردے کی طرح آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اور میرے دونوں طرف سے آوازوں کے پرندے اپنی اپنی جگہ تبدیل کر رہے تھے۔

میں تو جانوں کنیزن نے میاں کو کھلائے دیا ہے پکائے کے۔

”الو کا گوشت!“

"اے توبہ ہے تمھاری زبان ہے کہ فلیتہ۔"

"ہاں مغرب کے بعد تو ہم "نکھی" بول دیتے ہیں۔"

"بجّو تم کیا کہہ رہی تھیں؟"

پان دان جھنجھنا کر بند ہو گیا اور اُگال دان میں پیک کی پچکاری چھٹ گئی۔

کہہ یہ رہے تھے کہ میاں کے جو بڑے باپ تھے اللہ بخشے قاضی ارجمند علی انھوں نے جب نیا مکان بنایا اور بس گئے تو ایک رات خواب دیکھا کہ جہاں تم نے پاخانہ بنایا ہے وہاں ہمارا گذر ہے اسے فوراً ہٹالو، صبح دسترخوان پر ذکر اذکار ہوئے ایک ایک آدمی کہہ سن کر تھک گیا لیکن بڑے میاں کے کان پر جوں نہ رینگی ......

دو راتیں کسی طرح جاگتے سوتے گذریں اور تیسری کی صبح لاش ملی بستر پر......

بیچ یہ آن پڑا کہ انہیں اللہ ماری کنیترن کی شادی ہونے والی تھی اگلے مہینے۔ میاں بچارے نے یتیم بہنا کو بہت سمجھایا۔ ارے طوطے کی طرح پڑھایا وہ تو قاضی ارجمند کی اکلوتی بیٹی ٹس سے مس نہ ہوئیں نہ پاخانہ ہٹنے دیا نہ تاریخ بڑھنے دی۔

اللہ رے دیدے کا پانی۔ خیر اسی گھر میں اسی تاریخ کو شادی ہوئی۔ ان کو بھی خواب دکھلایا گیا۔ تنبیہہ کی۔ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ پہلے شہتیر ایسا شوہر گیا، پھر پھول ایسا بچہ۔

"اور ان جنم جلی کو کچھ نہ ہوا؟"

"ارے ہوا کیوں نہیں...... ہوا یہ کہ وہ ان پر آگئے۔ آنکھیں دیکھتی ہو اس بڑھاپے میں بھی پوری کھول کر دیکھ لیں تو دوا رے بندھا ہاتھی ڈبکیاں کھانے لگے۔"

"ڈبکیاں تو کھا رہے ہیں، بچارے میاں۔"

"تمھارے منہ میں خاک۔"

"اللہ ان کا سایہ قائم رکھے۔"

"ہاں مگر کینزن کا منہ ایک طرف اور خدا کی خدائی دوسری طرف۔ کیا مجال جو پلک جھپکتے تعمیل نہ ہو۔"

اے دولھن تم نے کبھی غور کیا، گھر میں قدم رکھو تو کلیجہ ہولنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے دیواریں اوپر آئی جاتی ہیں۔ یہ سب کیا ہے آخر؟ اچھا تم پھاٹک کو نگاہ بھر کر دیکھ لو...... دیکھ پاؤ تو۔ کون سپاہی تھا بھلا سا نام....

"درگا تھا۔ برنا پور والا۔"

"ہا...... کیسی جوان موت ہوئی"

رات پہرے پر تھا ایک بار نگاہ اٹھا کر پھاٹک کے طاقوں کو دیکھ لیا۔ یوں ہی بس دیکھتا رہا۔ پھر چیخ مار کر بھاگا...... گھنٹوں بے ہوش رہا مصیبتوں سے بولا کہ طاقوں پر سر رکھے ہیں، کٹے ہوئے تازہ تازہ ......"

بس یہ کہنا تھا کہ تیورا کر گرا ...... جب تک میاں برآمد ہوں.... ٹھنڈا ...... ایک بوڑھا ٹھنڈا ہاتھ میری پیشانی پر سیر کرنے لگا۔

"اے دولھن دیکھو تو ...... پھنک رہا ہے۔ بچارہ بچہ۔"

ان واقعات سے ابھی میرا حافظہ دہک رہا تھا کہ ایک اور حادثہ ہو گیا۔ دوشنبہ کا دن تھا اس دن بابا عدالت کرتے تھے۔ مقدمہ پیش ہو رہا تھا۔ منشی جنگ بہادر مثل پڑھ رہے تھے۔ کسی ایسی زبان میں جسے میں نہیں جانتا تھا

کہ پھاٹک پر بیٹھے پولیس کے چوکیدار نے گھبرا کر اطلاع دی...... کہ کھا کھا آ رہی ہیں۔ ان کو بابا کے علاوہ سب کھا کھا کہتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں۔ بابا نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کارروائی رک گئی۔ سب ادھر ادھر ہونے لگے جسے کچھ نہ ملا اس نے اپنے رومال یا انگوچھے سے آنکھیں چھپا لیں اور ان کی طرف سے پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ چھوٹے چھوٹے نیے تلے قدم رکھتی آئیں اور کڑک کر بولیں۔ اے فرخند علی۔ یہ ملو کمہار پر تم نے پچاس روپے جرمانہ کر دیا۔ یہ نہیں سوچا کہ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہم سے تم سے بوڑھے ماں باپ ہیں۔

"ارے بھائی کینزن تم تو ۔"

اس نے طمنچہ بنایا ہے۔ تمھارے کسی خوشامدی نے تم سے جڑ دیا اور تم نے مان لیا۔ ارے اللہ سے ڈرو اللہ سے۔

بابا نے پیچوان کی نے گاؤ پر پھینک دی۔

"سپاہی!" وہ گرجے۔

مختار عالم سے کہو ملو کا جرمانہ ہمارے حساب سے ادا کر دے۔

لو بھائی اب تو ہو گیا نا...... اب تو جاؤ اندر...... ایں"

اور وہ بڑبڑاتی ہوئی جس طرح آئی تھیں اسی طرح چلی گئیں۔ بے نیاز اور بے محابہ لیکن ان کے جانے کے بعد بھی ایک عالم طاری رہا۔ بابا نے پانی مانگا۔ گلوریاں چبائیں۔ حقّے کے گھونٹ پر گھونٹ لیے۔ بات بے بات اچھے بھلے آدمیوں کے نام رکھے۔ اور عدالت برخاست کر دی۔

اور ابھی میں بابا سے لڑائی سے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

بیٹھے بیٹھے بات کرتے کرتے اچانک..... ایک کہرام برپا ہو گیا۔

اور جب قبر میں جنازہ اتارا جانے لگا تو ایک طرف سے آدمیوں کا ہجوم پھٹا اور کھا کھا طلوع ہوئیں۔ آج پہلی بار ان کے کپڑے میلے تھے۔ بال بھی دونوں طرف اڑ رہے تھے۔ فرشی پائجامے کے پائنچوں پر مٹی کی چوڑی چوڑی گوٹ لگی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں کی سرمئی سرمئی سی پتلیاں اور ہلکی ہو گئی تھیں۔ اور ڈھیلوں کے کافور میں ڈھلی جا رہی تھیں۔ میرے باطن نے غلیل چڑھالی اور سلام کا غلہ مارنے کے لیے کان تک کھینچ بھی لی۔ لیکن پھر غلیل ہاتھ سے پھینک دی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھیں۔ شاید میرے پیچھے کھڑے کسی شخص کو گھور رہی تھیں اور پھر رفتہ رفتہ لوگ بابا کو بھول گئے اور لوگوں کے بھول جانے کی اس عادت کا اثر کھا پر بھی پڑا۔ اب وہ اکیلی اپنے پھاٹک کی کھڑکی میں کھڑی رہتیں۔ ساری ساری دوپہر سارا سارا دن کھڑی رہتیں۔ لیکن ان کے پاس بھولے سے کوئی مقدمہ نہ آتا۔ کوئی اپیل نہ ہوتی۔ اب ان کے کپڑے بھی میلے ہونے لگے تھے اور آواز کا کرارا پن بکسنے لگا تھا اور اپنے آپ سے باتیں کرنے کا مرض شدت اختیار کر چکا تھا اور اب ہمارے گھر ان کا آنا جانا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ پھر محرم کا چاند دیکھا گیا۔ چچا جان نے اپنے نئے نئے اختیار اور انتظام کے اظہار کے لئے پرانی روایتوں پر نئی قلعی کی۔ روشنی اور جلوس اور سبیل اور لنگر کے مصارف اسراف کی حد تک پہنچا دئے۔ وہ نو محرم کی رات تھی۔ امام باڑہ چراغوں کی چادروں میں جھلملا رہا تھا۔ چاند منبر پر بیٹھا آسمان کے ستاروں اور امام باڑے کے چراغوں کو اپنا نیا مرثیہ سنا رہا تھا اور سڑکیں سنسان ہونے لگی تھیں اور مشہور قدیمی تعزیوں کے چوک سے بھیڑ رخصت ہو چکی تھی اور مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گیلی گیلی یادیں آنکھوں پر بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے تعزیے کے چوک کے نیچے چبوترے کے فرش پر بابا کے گاؤ تکیے سے لگا بابا ہی کے انداز میں ایک پیر پر پیر

رکھے لیٹا ہوا تھا۔ پھر معلوم نہیں جی میں کیا آئی۔ میں نے آستینوں سے آنسو پونچھے۔ اٹھا۔ جوتے پہن رہا تھا کہ اونگھتے ہوئے بوڑھے بوڑھے سپاہیوں نے گردنیں اٹھا اٹھا کر دیکھا اور لاٹھیاں ٹیک کر کھڑے ہو گئے۔ امام باڑے کا دروازہ بند تھا۔ پہلی سیڑھی پر تھا کہ دربان نے کان میں گذارش کی کہ کھا کھا اندر ہیں اور ان کا حکم ہے کہ کوئی آنے نہ پائے۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ہٹا دیا۔ ضریح مبارک کے گرد کھنچی ہوئی صندل کی جالی پر سر رکھے کھا کھا کھڑی تھیں۔ رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں:

"مولا تم نے باپ کو چھین لیا...... میں چپ رہی۔ شوہر چھین لیا۔ کلیجہ مسوس کو رہ گئی۔ کہ صورت سے آشنا بھی نہ ہوئی تھی۔ تم نے کوکھ اجاڑ دی تب بھی آہ نہ کی۔ شیر خوار کا رونا کیا۔ ایک فرخند علی ــ کہ باپ بھی وہی تھے اور بیٹے بھی وہی تھے تم سے ان کا ساتھ بھی نہ دیکھا گیا۔ اب تم ہی بتاؤ کیا کروں۔ کس کے سہارے یہ رنڈاپا کاٹوں۔"

اور وہ ہچکیاں لیتے لیتے نڈھال ہو گئیں۔ جب ہاتھ سے جالیاں چھوٹنے لگیں تو میں نے لپک کر سنبھالنے کی کوشش کی میرا ہاتھ لگتے ہی وہ بجلی کی طرح تڑپیں۔ دھاڑ دھاڑ روتی آنکھیں پوری کھول کر مجھے دیکھا۔ اور چیخ ماری۔

"میرا فرخند علی ـــــ میرا باپ میرا بیٹا!"

اور بھاگتے قدموں کی آواز سنی گئی۔ سپاہی اندر گھس آئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹے رو رہے تھے۔ معلوم نہیں کب تک روتے رہے۔

اقبال مجید

مدافعت

آنکھوں میں،
ناک میں،
پھیپھڑوں میں،
سانسوں میں،
دھواں ہی دھواں تھا ـــــــ
اور وہ سب زمین پکڑے لیٹے تھے۔
ہوا خاموش تھی، اس لیے دھواں زیادہ تھا ـــــــ ساکت ہوا میں دھواں اڑکر بکھر نہیں پاتا۔
تمام سمتوں سے دھویں کے بادل آرہے تھے۔
ایک مکان میں آگ لگ گئی تھی اور وہ سب آگ بجھانے دوڑ پڑے تھے۔
وہ باخبر لوگ تھے؛ آگ، اس کی ہلاکت خیزی اور آگ کی نوعیتوں سے

بارے میں بڑی معلومات تھیں انھیں۔

مکان کے اندر پہنچنے کے لیے صرف بلندی پر ایک کھڑکی انھیں کھلی نظر آئی۔ سیڑھی لگا کر وہ اُس کھڑکی تک پہونچے۔ دھویں کے دیو قامت مرغولے کھڑکی کے راستے باہر نکل رہے تھے۔ جو سب سے آگے تھا اس نے پانی پھینکنے والا پائپ پکڑ رکھا تھا۔ آخر اس نے پانی کا نشانہ سادھا اور کھڑکی کے راستے کمرے کے اندر موٹی سی تیز دھار کو پھینکنا شروع کیا۔ یہ دھار بڑی سفّاک تھی۔

اندر کیا ہے؟ نہ تو اُس آدمی کو معلوم تھا جو سب سے آگے تھا اور نہ اُنھیں جو سب سے پیچھے تھے۔ آگ کس چیز میں لگی ہے؟

یہ سوال اُن لوگوں کے لیے بہت اہم تھا جنھیں آگ بجھانا تھی۔

آگے والا پانی کی دھار سے دھویں کے بادلوں کو کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور کھڑکی کے قریب پہونچ چکا تھا۔ وہ اندر جھانکنا چاہتا تھا۔ وہ جتنے دھوئیں کے پہاڑ دھار سے کاٹتا، اُتنے ہی پہاڑ اور سامنے آجاتے۔ نیچے لوگ بڑھ رہے تھے۔ یہ لوگ دیکھنے میں مصروف تھے، صرف دیکھنے میں۔

تب سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے لوگ کھڑکی کے ذریعہ کمرے کے اندر کود گئے۔

اندر انھیں کچھ دکھائی دے رہا تھا — کمرہ دھویں کی گیند ہو رہا تھا۔ پیر کمرے کے گیلے فرش کو محسوس کر رہے تھے۔ ان سب کو لگا کہ دھواں ان کے نتھنوں سے ہو کر پھیپھڑوں میں بھر رہا ہے۔ ہر سانس میں ہوا کے بجائے وہ دھواں نگل رہے تھے۔ دھواں بھری آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور تب جو سب سے آگے تھا، وہ جلدی سے کمرے کے فرش پر اوندھا ہو کر لیٹ گیا۔ مدافعت

کا یہ سب سے پہلا اصول ہے۔

جب دھوئیں میں گھر جاؤ تو فوراً زمین پکڑ لو۔

دھواں ہمیشہ نیچے سے اوپر کی طرف جاتا ہے۔

کھڑے رہنے کی حالت میں دم جلدی گھٹ جائے گا۔

اس لئے زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ جاؤ۔

سینہ بالکل زمین سے چپکا لو۔

اُن سب لوگوں نے اپنے اگلے ساتھی کی طرح اوندھے ہو کر زمین پکڑ لی وہ سب خاموش تھے اور زمین پکڑے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ اُس کمرے میں شاید اُن کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

کافی دیر زمین پکڑے پکڑے ان میں سے ایک قدرے بے چین ہو گیا۔ اس نے چپکے سے آگے والے سے کہا۔

"اب کیا کرنا چاہیئے؟"

"ہمیں دھوئیں سے اپنے کو بچانا چاہیے۔" اسے جواب ملا۔

کیونکہ اس نے بے چین ہونا شروع کر دیا تھا اس لیے اُس آدمی کی بےچینی بڑھتی گئی۔ وہ گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ دھواں اُس کی آنکھوں میں بھرنے لگا۔ اُس بے چین آدمی نے جلدی سے اپنا ماتھا زمین پر ٹکا دیا۔ تھوڑا توقف کر کے وہ زمین پکڑے پکڑے اپنے آگے کی سمت رینگنے لگا۔ وہ مشکل سے ایک ڈیڑھ فٹ آگے رینگ پایا ہو گا کہ دھوئیں سے اس کا دم گھٹنے لگا، اب وہ آگے والے کے برابر آ چکا تھا۔

"میرا دم گھٹ رہا ہے"۔ وہ برابر والے سے چپکے سے بولا۔

اُسے مشورہ دیا گیا کہ وہ اور آگے نہ بڑھے اور ناک پر ڈھاٹا کس لے۔ کیونکہ سب ہی ایسا کیے ہوئے ہیں لیکن اس نے ناک پر ڈھاٹا لگا کر ایک زور دار آواز لگائی۔

"کیا یہاں کوئی ہے؟"

دھویں بھری خاموشی میں وہ جواب میں کوئی آواز تو سُن نہ سکا، ہاں مُنہ کھولنے پر دھواں اُس کے پھیپھڑوں میں گھس گیا۔ اور اسے زوردار کھانسی آگئی۔ وہ اپنی کھانسی پر جب قابو پا چکا تو اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا اُسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اب وہ ایک بار پھر آگے کی طرف رینگنے لگا۔ اور بھی سب چیونٹیوں کی طرح آگے رینگ رہے تھے۔ انھیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جس کمرے میں وہ ہیں، اس کا طول اور عرض کیا ہے۔ وہ برابر زمین کو دائیں اور بائیں ٹٹول رہے تھے۔

وہ کیا ہے جو جل رہا ہے؟ لیکن مشکل یہ تھی کہ کچھ بھی نہیں جل رہا تھا، سارا سامان، فرش، دیواریں، چھت اور فرنیچر، سب اُسی طرح تھا۔ کہیں بھی کچھ جلتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا، نہ کوئی شعلہ، نہ کوئی لو، بس دھویں کے موٹے موٹے پہاڑ تھے کہ اُٹھتے چلے آرہے تھے۔

"یہ آگ کدھر سُلگ رہی ہے؟" زمین سے چمٹے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے سوال کیا۔

"داہنی طرف" ایک آواز آئی۔

"نہیں بائیں طرف۔" دوسری آواز نے کہا۔

اور تب ہی انھیں آگ بجھانے کے وہ اصول یاد آئے ____ آگ سے بچنے کی تین صورتیں ہیں۔

آگ کو آکسیجن مت فراہم ہونے دو۔

وہ سامان ہٹا دو جو فوراً آگ پکڑتا ہے۔

لیکن جس صورتِ حال سے وہ گزر رہے تھے، وہ خاصی پریشان کن تھی۔ اگر شعلے نکل رہے ہوتے، جلتی لکڑیاں چٹخ رہی ہوتیں تو یہ لڑائی کتنی آسان ہو جاتی۔ پانی کی مار دھوئیں کے لیے بیکار ثابت ہو چکی تھی۔ ان کے لیے دم گھٹا دینے والا دھواں چاہے داہنی سمت سے ہو یا بائیں سمت سے، اسے روکنا بیحد ضروری تھا۔ وہ یہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ جب تک یہ دھواں ان کے سروں پر ہے وہ اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ اور وہ اوپر اٹھنا چاہتے تھے۔

"کیا تم کسی نتیجہ پر پہونچے؟" پیچھے والے نے آگے والے سے سوال کیا۔

"ہاں ____" وہ اپنی ناک پونچھتے ہوئے بولا۔ "یہ کہ اس دھوئیں سے ہمیں اپنے کو بچانا چاہیے۔"

"مگر کب تک بچانا چاہیے؟" وہ بہت دیر سے بے چین تھا، اس جواب کو سُن کر جھنجھلا پڑا۔

"تب تک بچانا چاہیے، جب تک یہ دھواں ہے۔"

"کیا ہم یوں ہی زمین پکڑے لیٹے رہیں؟"

"مدافعت کے لیے یہی ضروری ہے۔"

اور تب پیچھے والوں کو یاد آیا کہ دھواں آگ سے زیادہ خطرناک شے ہے، دھواں بے بس کر دینے والی چیز ہے۔ دھواں جیسے جیسے بڑھتا جاتا ہے سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے ـــــ سب گھُٹ کر مر جائیں گے!

سب کھانس رہے تھے، ناک سے پانی بہا رہے تھے، گھُٹی ہوئی سانسوں نے سب کے گلوں کی رگیں پھُلادی تھیں۔ اس صورت حال سے جو سب سے زیادہ پریشان تھا، وہ پھر بولا۔

"یا تو آگے بڑھو یا پھر کھڑکی راستے واپس لوٹ چلو۔"

اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی پشت پر دیوار میں ایک کھڑکی اور دکھائی دی جو بند تھی۔ یہ کھڑکی اُس کھڑکی کی داہنی طرف تھی جس سے وہ لوگ اندر آئے تھے۔

اس نے اپنے برابر والے سے کہا۔

"ہم سب اندھے ہو گئے ہیں کیا؟ ابھی ایک کھڑکی بند ہے، میں اسے بھی کھولے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ کھڑکی کی طرف رینگتا ہوا جھپٹا اور دیوار پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی سانس روک لی۔ بند آنکھوں سے وہ کھڑکی میں لگی سٹکنی کو ٹٹولنے لگا۔ ذرا سی دیر میں سٹکنی اس کے ہاتھ آگئی۔ وہ اب بھی سانس روکے تھا اور سٹکنی پر اپنا زور آزما رہا تھا جیسے برسوں سے اُسے کبھی کھولا نہ گیا ہو۔ اس کا دل سانس رکے رہنے کی وجہ سے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا کلیجہ باہر آجائے گا۔ وہ جلدی جلدی زور لگانے لگا۔ سٹکنی میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ اب اسے لگا کہ

اس میں سانس روکے رہنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ اس کا دم چھوٹنے لگا تھا' طاقت جواب دے رہی تھی۔ ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اس نے ایک آخری کوشش کی۔ دانت بھینچ کر زور لگایا۔ اس بار سٹکنی گھوم گئی اور نیچے اُتر آئی۔ اس نے پاگلوں کی طرح اُسے اس طاقت سے اپنی طرف کھینچا جو طاقت کسی کا دم نکلتے وقت اس کے جسم میں واپس آجاتی ہے۔ دونوں پٹ یکبارگی کھل گئے۔ تازہ ہوا کا جیتا جاگتا جھونکا اس سے ٹکرایا۔ اس کی سانسیں فوارے کی طرح چھوٹ پڑیں۔ اس کے بعد کیا ہوا، اسے یاد نہیں۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اس کھڑکی کے قریب ہی زمین پر اوندھا پڑا ہے اور اس کے چہرے پر پسینہ ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے ہاتھوں میں حرکت پیدا کی اور اپنے آس پاس ٹٹولنے لگا کوئی اس کے قریب ہی کمرے کے فرش پر زمین سے چپکا پڑا تھا۔ اس نے کہا۔

"دیکھو میں نے دوسری کھڑکی بھی کھول دی۔"

برابر والا جواب میں کچھ نہیں بولا۔ اس کی تھکی تھکی سی سانسوں کی آوازیں البتہ کانوں میں سنائی دے رہی تھیں۔ تب اس نے پھر کہا۔

"سنا نہیں تم نے۔ اب دھواں دوسری کھڑکی کے راستے بھی باہر نکل رہا ہے۔"

"نہیں! اب دھواں پہلے سے اور زیادہ آ بھی رہا ہے۔"

اس نے دیکھا واقعی دھویں کی تہیں اور موٹی ہو گئی تھیں۔ کمرہ جیسے سکڑ کر اور چھوٹا ہو گیا تھا۔

وہ رینگ کر اپنے دوسرے ساتھی کے قریب گیا اور بولا۔

"کیا اس طرح پڑے پڑے تمھارا دم نہیں گھٹ رہا ہے؟"

"نہیں۔" اس کا ساتھی بولا۔" دم تو اٹھ کر کھڑے ہونے میں گھٹتا ہے۔

اس نے پھر سوال کیا۔

"کیا تمھارے پھیپھڑوں میں دھواں نہیں گھس رہا ہے؟"

"میرے پھیپھڑے پہلے کے مقابلے میں اب دھوئیں کے کچھ عادی ہو گئے ہیں۔"

وہ اِس جواب پر تڑپ اُٹھا۔ اپنے بائیں طرف گھوما اور وہاں پر چپکے ہوئے جوان سے بولا۔

"کیا تم بھی یوں ہی ماتھا ٹیکے پڑے رہو گے؟"

اس جوان نے جواب میں اسے بتایا کہ اس کے دو ہاتھ آگے ایک دروازہ ہے اور وہ اس دروازے تک پہونچ بھی گیا تھا، اسے کھولنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ اپنے دم کو روک نہیں سکا۔

یہ خبر پاکر دو ہاتھ کی دوری پر ایک دروازہ اور ہے جو کھولا جا سکتا ہے، اس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ اُمید کی ایک نئی کرن جاگ اٹھی اور وہ تیزی سے اُس سمت رینگنے لگا۔ جب اس نے ہاتھ بڑھایا تو واقعی اس کا ہاتھ ایک دروازے سے ٹکرایا۔ وہ جوش میں کچھ سوچے سمجھے بغیر کھڑا ہو گیا۔ آہنی سٹکنی پر وہ پوری طرح جھول گیا۔ اپنی ساری قوت یکجا کر کے وہ دروازہ کھولنے لگ گیا۔ یکبارگی اس کا دم چھوٹ گیا۔ کھانسی کا بھیانک دورہ اُسے دُہرہ کیے دے رہا تھا لیکن اس نے سٹکنی نہیں چھوڑی۔ اسے لگا کہ اس کا دم نکل جائے گا لیکن وہ سٹکنی سے لڑتا رہا۔ اسے جیسے یقین تھا کہ یہ دروازہ کھلتے ہی کمرے کا سارا دھواں دو پلوں میں ہوا اُڑا لے جائے گی۔ اور وہ تازہ ہوا میں سانس لے سکے گا۔ وہ دروازہ اسے نجات

آخری راہ نظر آرہا تھا۔ کھانسی اسے بے حال کر چکی تھی۔ دھویں کی بے تحاشہ بُو اس کے پھیپھڑوں کو تازہ کم چکی تھی لیکن وہ سٹکنی سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں شاید زخمی ہو چکی تھیں اور تب ہی جانے کس لمحے وہ دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا لیکن جب دونوں پٹ کھلے تو اس نے دیکھا، وہ ایک دوسرا کمرہ تھا جہاں دھویں کے مرغولوں کے زبردست پہاڑ اس کی طرف بڑھنے کے لیے نہ جانے کب سے تیار کھڑے تھے۔ وہ گھٹی ہوئی سانسوں کے ساتھ چیخا۔

"مجھے تازہ ہوا چاہیئے۔"

"تازہ ہوا؟" دھیرے سے آواز آئی۔

"جہاں بھی ہو، مجھے تازہ ہوا چاہیے۔ میں اس دھویں میں نہیں رہ سکتا۔"

"وہ تو تمھیں رہنا پڑے گا۔" اسے ٹوکا گیا۔

"لیکن کیوں رہنا پڑے گا؟"

اسے جواب ملا۔

"اپنی مدافعت کے لیے۔"

وہ ان سب سے کہنا چاہتا تھا۔

کیا یہاں ایسا کوئی دروازہ نہیں، جس کے کھولتے سے تازہ ہوا آسکے؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم تم ادھر سب مل کر کھڑے ہو جائیں؟

یہ زمین چھوڑ کر آگے بڑھیں!

دیواروں پر نئے دروازوں اور روشن دان کو تلاش کریں!

اگر دھواں ہمیں کھڑا نہیں ہونے دیتا تو آؤ ہم سب رینگ رینگ کر آگے بڑھیں!

اس کے ساتھی نے پوچھا۔

"تمھاری داہنی طرف کیا ہے؟"

"دھواں ـــــ"

"بائیں طرف؟"

"دھواں ـــــ"

"تمھارے اوپر کیا مسلّط ہے؟"

"دھواں ـــــ"

"اس لیے نیچے دبکے پڑے رہو کیونکہ سب سے کم دھواں نیچے ہی ہے۔"

"لیکن یہ تو جبر ہے۔"

"ہاں اور جبر کے حالات میں زمین پکڑ کر پڑے رہنا ہی مدافعت ہے۔"

"لیکن یہ تو بزدلی ہے۔"

"نہیں یہ مدافعت ہے۔"

"مدافعت ...... دم گھٹا دینے والے حالات میں جان دینے سے بہتر مدافعت تو کھلی ہواؤں میں جان دینا ہے۔" ـــــ وہ اپنی تمام قوت کو یکجا کر کے فرش چھوڑ کر پورے قد سے کھڑا ہو گیا، دھویں میں ہاتھ پیر مار کر ڈگمگاتے قدموں سے چل کر، وہ اس کھڑکی تک آیا جو انھیں کمرے کے اندر لائی تھی اور کھڑکی کے نیچے پھاند گیا۔

●

اس کی لاش کو نیچے کھڑے ہوئے لوگوں نے گھیر لیا۔ وہ اسے غور سے دیکھ

رہے تھے، بھیڑ میں سے کوئی بولا۔

"یہ تو اپنے آدمیوں میں سے نہیں ہے۔"

کسی نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں، یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

●

اوپر کے دھویں بھرے کمرے میں کیا ہوا؟ کہتے ہیں کہ دھویں نے کمرے میں زمین پکڑ کر پڑے رہنے والوں کو بھی نہیں چھوڑا ــــــ وہ دھواں کم ہونے کا انتظار کرتے رہے اور دھیرے دھیرے اُن کا دَم گھُٹ گیا اور وہ مر گئے۔ ــــــ اُس صورتِ حال میں دھویں سے مدافعت کرتے کرتے کون کس طرح مَرا، وہ اس کہانی کا موضوع نہیں ہے۔

جوگندر پال

کتھا ایک پیپل کی

سارے کا سارا پیپل کا درخت کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے اس کا قد فٹ بھر اور اونچا ہو گیا۔

پرندوں نے پیپل کی ہلتی ہوئی شاخوں پر اپنے پیر دبا لیے۔ اور ایک کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ "گھبراتے کیوں ہو بھئی؟ اپنا پیپل کا کا ذرا ترنگ میں آگیا ہے اور بس!"

"کا کا ہے کہاں، ماں؟" ایک چڑیا کے بچے نے اپنی ماں سے پوچھا اور جواب سننے سے پہلے ہی گھونسلے میں چاول کے ایک دانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمھاری یہ بات مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی چھو کرے!" اس کا باپ بولا۔

"تو پھر دوسری آنکھ سے دیکھو۔" چڑیا پھر سے اپنے بچے کے قریب آگئی اور پیار سے اپنی چونچ کو اس کے پروں میں گھسیڑ لیا۔ "تمھارا ہی بچہ ہے، یا کم سے کم اپنی ہی ذات میں سے کسی کا ہے، کسی کوے کی اولاد تو نہیں۔" اس نے اپنی آواز

ذرا آہستہ کر لی کہ آس پاس کوئی اس کے بول کی بھنک نہ پالے۔ پہلے ہی سے سب کو شکایت تھی کہ اس برا ہمنی کو اپنی اونچی ذات پر بڑا مان ہے۔

"بس جی چپ رہو تم۔ بچے کی نیا ڈبو کر دم لو گی۔"

پھر وہی موئے آدم کا کا نا سا محاورہ! —— ہمیں نیا دیا سے کیا لینا ہے؟ ہمارے یہ پر سلامت رہیں ——" اس نے اپنے پر پھیلا کر اپنے نر کی طرف آنکھیں مٹکائیں۔ "کہو کیسے ہیں؟"

اور نر اپنی مادہ کے قریب سرک آنے کی خواہش سے بے تاب ہو ہو کر اس سے آگے نکل گیا اور پھر لوٹ کر اس سے جڑ کر بیٹھ گیا۔

ان کا گھونسلا چھوٹا سا تھا لیکن وہ تینوں اس قدر جڑ کر بیٹھے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دس اور بھی آ کر ان سے جڑ جائیں تو گھونسلا اتنا ہی کھلا لگے گا۔

"گڈ مارننگ، ایوری باڈی!"

پیپل کے کئی مکینوں نے تعجب سے سر اٹھا کر دیکھا کہ یہ کون کیا کہہ رہا ہے۔

اور سب سے اونچی شاخ پر بیٹھے ہوئے ایک طوطے نے ان کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو کر چیخنے کے انداز میں دہرایا۔ "گڈ مارننگ ایوری باڈی!"

نہ طوطے کو معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ پیپل کے باسیوں کو، اس لیے بولنے اور ہنسنے والوں میں از خود طے پا گیا کہ ضرور کوئی بڑا گہرا نکتہ ہے۔

"نہیں، کوئی گہرا وہرا نکتہ نہیں"۔ کبوتر نے غصے سے اپنی مادہ کی طرف دیکھ کر کہا جو دیوانوں کی مانند سر اٹھائے پرائے مرد کو گھورے جا رہی تھی۔ "میں بتاتا

ہوں کہ اصل بات کیا ہے۔ اس طوطے کے اندر ایک دیو چھپا ہوا ہے۔"
کبوتری نے برقعہ اوڑھ لینے کے انداز میں اپنی دونوں آنکھیں بند کر لیں۔
"ہائے اللہ! ـــــ تم کیسی ڈراؤنی باتیں کرتے ہو؟ـــ"
"تو پھر وہ اپنی زبان سے کیوں نہیں بول رہا ہے؟"
"گڈ مارننگ، ایوری باڈی!"
"سُن رہی ہو؟ ـــــ اتنا بڑا دیو غریب کے گلے میں آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا ہے۔"
بے چارہ اپنے من کی سیدھی سادی بات کر پائے تو کیوں کر؟ ـــــ اور سُنو!
اری سو گئی ہو؟ ـــــ سنو ـــــ! ـــــ اگر اس طوطے نے یہیں ڈیرے ڈال لیے
تو دیو ہمارے پیپل کاکا کی جڑوں میں اتر کر انھیں کھا جائے گا اور پھر کاکا اور
تم اور میں اور ہم سب دھڑام سے نیچے جا گریں گے۔"
"گڈ مارننگ، ایوری باڈی!"
طوطے نے اپنے پر کھول کر باریک سی شاخ سے اپنے پاؤں اٹھالیے تو شاخ
بھی اس کے پیچھے جانے کی خاطر بے اختیار اچھلی۔
"ار ـــــ رر! کاکا اسے تھام نہ لیتا تو وہ ٹوٹ کر گر جاتی۔" کہاں جا رہی ہو؟
شاخ نے لہرا کر طوطے کی طرف دیکھا۔
"جسے خود آپ معلوم نہیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے، اس کے پیچھے تم کہاں جاؤ گی؟"
کاکا نے اسے گلے میں ڈال لیا۔" تیرا میرا مقدر ایک ہے بیگی۔ مجھے چھوڑ کر کہاں
جاؤ گی؟ ـــ اور جانا بھی چاہو گی تو ٹوٹ کر دم توڑ دو گی۔"
طوطا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور شاخ نے اپنے بھرے بھرے جی سے

اپنی باہیں پیپل کے گلے میں کس لی تھیں اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی ہری بھری سہاگن کے مانند وہ بڑھتی پھیلتی جا رہی ہے ــــــ

"ایک بات پوچھوں" اس نے اپنے پیپل سے کہا "تمھارے پر کیوں نہیں ہیں؟"

"پر نہ پیر پگلی، اٹھتے یا چلتے ہوئے محبت نہیں کی جا سکتی۔" پیپل کا اپنا پچھلا جنم یاد آ رہا تھا "میری کہانی سنو گی؟ ــــــ کئی سو سال ہو لیے ہیں یہاں اُگنے سے پہلے میں ایک آدمی تھا، ایک مسافر، جسے کہیں بھی کوئی نہ جانتا۔ سب لوگ، سب جگہیں میرے لیے اجنبی تھیں۔ مجھے کسی سے محبت نہ تھی، کوئی مجھ سے محبت نہ کرتا تھا۔ میری ساری عمر یوں ہی گھومتے پھرتے بیت گئی، اور بیت گئی تو مجھے پتہ چلا کہ ہر جگہ وہی جگہ ہے، وہی آسمان ہے۔ میں نے آسمان سے دوستی کرنا چاہا لیکن اس کی جانب ٹکٹکی باندھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ وہ بہت دور ہے، میں کتنا ہی قریب جانا چاہوں یہ دوری جوں کی توں رہے گی ــــــ یہ دوری ــــــ ارری سو گئی ہو کیا؟ ــــــ جب میں آدمی تھا اور پیہم چل چل کر دنیا کی ہر شے کے قریب آ جانا چاہتا تو مجھ سے جوں کی توں رہتی تھی۔ میں کسی کو اپنا نہ سکا، اور تو اور، میں اپنے آپ سے بھی چھن گیا، چلتے پھرتے جانے کہاں نکل گیا اور یوں اپنی ہی ناکام تلاش میں میری ساری عمر گذر گئی ــــــ ارے نیند آ رہی ہے کیا؟ آنکھیں کھول کر میری بات سنو! ــــــ"

"میں آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو تم مجھے سارے کے سارے نظر آتے رہتے ہو۔ بولتے جاؤ ــــــ"

"تو سنو! ــــــ جب میں مرنے لگا تو بہت خوش تھا کہ میری روح پھر سے

اڑ کر آکاش سے جا ملے گی ـــــ پھر اچانک میری روح نامعلوم کہاں چلی گئی، یا شاید مجھے میری روح سمیت ہی دفن کر دیا گیا ـــــ یہیں، جہاں میں اگا ہوا ہوں اور ـــــ اور ـــــ نہیں یوں نہیں، آنکھیں کھول کر میری بات سنو۔ اس طرح مجھے لگتا ہے کہ میں اپنی ساری باتیں اپنے آپ سے کیے جا رہا ہوں۔"

پیپل کی ساری شاخیں پیپل کو سن سن کر، اس کے قریب سرک سرک کر اس کے اندر آدھنسی تھیں اور انھیں لگ رہا تھا کہ وہ سب اپنے محبوب کے باطن میں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی ہیں اور لپٹ کر سب ایک ہی شاخ ہو گئی ہیں جو اس وقت پیپل کی گود میں سر ٹکائے اس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

"لو، میں نے آنکھیں کھول لیں ـــــ بولو اب!"

پیپل کی ملائم سی جڑ اس کی آنکھوں میں کھنچ کر گھل مل گئی۔ "بس میری یہی ایک مشکل ہے میری جان، تم اپنی آنکھیں کھول لیتی ہو تو میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

"تو میں پھر اپنی آنکھیں بند کر لوں؟"

"نہیں، یوں ہی میری طرف تک تک مجھے سنتی رہو ـــــ"

"بولو!"

"ہوا یہ کہ جب لوگوں نے مجھے یہاں دفنا دیا تو میں ابھی مرا نہ تھا، لیکن دھرتی سے باہر آنے کے لیے اب میرے لیے ایک ہی راستہ کھلا تھا، میں دھرتی میں سرایت ہو جاؤں، اور میں اسی راہ پر چل نکلا اور مٹی میں سرایت ہو ہو کر ایک دن مٹی کے باہر پہنچ کر منہ کھول لیا۔ ـــــ"

"ہائے جب تم نئے نئے اگے ہو گے تو کیسے لگتے ہو گے؟"

"میں اُگ کر باہر آیا تو میری پہلی خواہش تھی کہ بے اختیار اڑنا شروع کر دو ـــــ ارے کہاں جانا چاہتے ہو؟ ساری کی ساری زمین نے مجھے اوپر نیچے سے دبا کر مجھے پکڑ رکھا تھا اور میں بھری بھری مٹی کے اندر ہی اندر اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے وجود کے نیچے اب پاؤں نہیں رہے تھے۔ میری جڑیں تھیں جو اتنی آہستگی سے بڑی ہو کر زمین میں دھنستی جا رہی تھیں کہ مجھے ان کے ہلنے جُلنے کا قطعاً پتہ نہ چلتا تھا۔ اوپر اوپر سے ہوا میں پھڑپھڑاتے ہوئے مجھے لگتا گویا اپنی بے اختیار دوڑنے کی خواہش سے میری سانس پھولی ہوئی ہے۔ اور پھر میں تھک ہار کر سو جاتا اور خواب میں مجھے دکھائی دیتا کہ:

"تم میرے ہی پاس آنا چاہتے تھے نا؟" آکاش دھرتی سے آ لگا ہے۔

"ہاں!"

"تو لو، میں خود ہی تمھارے پاس آ گیا ہوں!"

پیپل کی اس سب سے اونچی، تازہ دم شاخ کا آنچل اڑ کر اس کے گھٹنوں پر آ گرا تھا مگر وہ اپنے اٹوٹ انہماک سے کہانی سنتی رہی۔ "پھر؟"

اور پیپل اپنا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور اسے اس طرح ننگے منھ، ننگے سر اپنی طرف متوجہ پا کر جھوم گیا اور جھومتے ہوئے اُسے اپنی بات یاد نہ رہی۔ "سنو!"

"سن تو رہی ہوں ـــــ"

"نہیں، میں ـــــ"

"میں دیر ہی کچھ نہیں۔ اپنی کہانی جاری رکھو۔"

"ہاں بابا، لیکن ـــــ"

"میں سب جانتی ہوں، تمھارے من میں کوئی میلا سا خیال آیا ہو تو منہ دھو آؤ۔"

"کیا فائدہ؟ منہ دھو کر بھی خیال تو میلا ہی رہے گا۔" پیپل نے شاخ پر ہاتھ ڈالنا چاہا مگر وہ ہل ہل کر اس سے صاف بچتی رہی۔

"ہہ ہا ہہ —— ہہ!"

ہا ہہ ہہ —— ہا!"

"پیپل کاکا کے ہنسنے کی آواز کہاں سے آ رہی ہے؟"

"اوپر اپنی رانیوں کے پاس گیا ہوگا —— آؤ، ادھر آؤ ذرا چونچ پھیر کر تمھارے پر صاف کر دوں۔"

"اچھا، کم سے کم میری بات تو سن لو۔"

"ہاں، شریفوں کے مانند صرف باتیں کرنا ہے تو دن رات کرتے رہو بولو!"

"دھیان سے سنو، بڑی خاص بات ہے۔"

پیپل کی دوسری شاخیں بھی جھک کر سننے لگیں۔

مجھے پیدا ہوئے کئی سو سال ہو چکے ہیں اور اس دوران میں اپنی ان گنت شاخوں سے بیاہ رچا چکا ہوں۔ ہر نئے موسم میں پوری کھیپ سے شادی کر لیتا ہوں، اور پھر وہ کھیپ پرانی ہو جاتی ہے تو میں اور وہ سب ایک ہو جاتے ہیں، ایک پیپل جسے آئندہ اپنی نئی شاخوں سے والہانہ محبت کرنا ہے۔

میری محبت اور عمر کو زوال نہیں، کیوں کہ میری ذات میری ان بے حساب محبوباؤں سے بھی عبارت ہے جنھیں ابھی صدیوں سے پیدا ہوتے چلے جانا ہے —— سُن رہی ہو؟ —— اپنی جن شاخوں سے بھی میں نے اب تک محبت کی ہے انھوں نے

بالآخر میری ذات بن کر میری سبھی محبتوں میں شرکت کی ہے، مستقبل کی سبھی محبتوں میں شرکت کریں گی۔ پیپل نے شاید اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھائی اور نیچے سے اوپر تک اپنی سب شاخوں سمیت بہ یک قالب و بہ یک روح لہرا اٹھا اور یہ سوچ سوچ کر لہراتا رہا کہ میری روایتیں اور جدتیں ہم وجود ہیں۔

پیپل کی دو تہائی بلندی پر گنجان شاخوں میں سے ایک کوّے نے سر جھکا کر نیچے دیکھا اور اپنی مادہ سے گویا ہوا۔ "ارے سنتی ہو، گھونسلے سے باہر آؤ۔"

کوّی تیز تیز برآمد ہو کر اپنے کوّے کے پاس آگئی اور اس کی گردن پر چونچ مار کر کہنے لگی۔ "پل بھر بھی چین سے بیٹھنے دیتے ہو؟ بولو کیا بات ہے؟"

"وہ دیکھو، وہ عورت کاکا کو پانی پلا رہی ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

خودکشی، "تاکہ میری جان چھوٹے۔" کوّے کو غصہ آنے لگا "ہر وقت لڑائی کے لیے تیار رہتی ہو۔ کبھی دو میٹھے بول بھی بول دیا کرو۔"

"کو —— و!"

کوّے نے سر اونچا کر کے کوئل کی جانب دیکھا جو ابھی ابھی وہاں آ بیٹھی تھی۔

"کو —— کو!"

"کتنی میٹھی آواز ہے!" کوّے نے اپنی چڑچڑی مادہ سے کہا۔ "اور کتنا پیارا رنگ ہے، گھور کالا! —— تم بھی اتنی چڑچڑی نہ ہوتیں تو تمہاری سیاہی پھیکی پڑنے سے بچی رہتی۔"

"وہ موئی راضی ہو۔" کوّی نے تنک کر کہا۔ "تو اسی سے اپنا گھونسلا آباد کر لو۔"

میں چلتی ہوں۔" وہ پھڑ پھڑانے لگی۔

"کہاں ؟"

"اتنی بڑی برادری ہے، تم نہ سہی کوئی اور سہی"۔

"بڑی نرموہی ہو۔ پل بھر میں برسوں کا ساتھ چھوڑ دینے پر تیار ہو جاتی ہو۔ ابھی تو ہمیں ڈیڑھ سو برس اور اکٹھا گزارنے ہیں ۔۔۔"

"کو ۔۔۔ کو"

اب کہیں جا کے ہمارے بھوگ بلاس کے دن شروع ہوئے ہیں۔ تم چلی گئیں تو میرا کیا ہو گا ؟"

جیسے کوری کی کوئی تنی ہوئی گانٹھ اپنے آپ کھل گئی ہو، وہ دھیرے سے اپنے نر کے قریب آ گئی اور بڑی آہستگی سے اس کی چونچ سے چونچ لگا لی، ایک پر کو پھیلا کر کوّے کے پروں پر ڈال دیا اور مسکرانے لگی اور کوّے کو برسنے سے پہلے تھمی ہوئی گھنگھور گھٹا کی طرح کالی کالی معلوم ہونے لگی ۔

"کو ۔۔۔ کو !"

کوّے کی آوارہ نظر اچانک نیچے کی طرف گھوم گئی جہاں وہ عورت کھڑی پیپل کو پانی دے رہی تھی ۔

"وہ دیکھو ! ۔۔۔ جانتی ہو وہ عورت پیپل کو پانی کیوں دے رہی ہے ؟"

"کیوں ؟" وہ اپنی چونچ سے اپنے نر کا وجود صاف کرنے لگی یا اس کے وجود سے اپنی چونچ ۔

اپنی ہی پیاس بجھانے کے لیے ! ۔۔۔ کتنی پیاسی نظر آ رہی ہے ! ۔۔۔

ادھر سے دیکھو، اس کی آنکھوں میں پورا ساگر بھرا ہوا ہے لیکن بیچاری کا حلق سوکھا ہوا ہے۔ میٹھے پانی کی ایک بوند بھی میسّر نہیں۔"

"بس تمھاری اسی ایک بات سے میں چڑ جاتی ہوں۔ سیدھی بات تمھارے منہ سے نکلتی ہی نہیں۔ اتنے سیانے بنتے ہو کہ لگتا ہے، تم محبت کر ہی نہیں سکتے۔"

"بے وقوف میں سیانا ہوتا تو سینکڑوں ہزاروں میں سے ایک میں ہی تمھیں اڑا کر کیسے لے آتا، ـــــ"

"لیکن میرے سیانے کوّے، اب ذرا بے وقوف بننا بھی سیکھ لو، نہیں تو کوئی ادھ مجھے اُڑالے جائے گا۔"

"اور تم چپ چاپ اس کے ساتھ اُڑ جاؤ گی؟"

"اس وقت کے بارے میں میں تمھیں آج کیا بتا سکتی ہوں؟ کوی کی بجائے عورت ہوتی تو مجھے معلوم ہوتا کہ کس دن، کس وقت مجھے کس مردوے کو چھوڑ دینا ہے ـــــ"

"اری دیکھو!" کوّے نے اپنی مادہ کے لیے جگہ بنانے کے لیے شاخ پر ذرا پرے ہٹ کر کہا۔ "وہ عورت ہاتھ جوڑ کر پیپل کا کا سے کچھ مانگ رہی ہے۔ جانتی ہو کیا؟"

"کیا؟"

"بچّہ! ـــــ"

"ہاں، اسے اپنے شوہر کے مقابلے میں ہمارے پیپل کا کا پر زیادہ وشواس ہے۔"

"ہاں، کیوں کہ وہ جب بھی یہاں آتی ہے کا کا۔ یہیں ان کا منتظر ہوتا ہے۔

مردوں اور کوؤں کا کیا بھروسہ، آج کسی سے ملو تو کل اس کی شکل بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے، یا شاید مُوا اپنی جگہ کوئی اور کھڑا کر کے کہیں نکل جاتا ہے۔"

"میری طرف دیکھو، کیا میں بھی ـــــــ؟

"مجھے کیا پتہ، تم وہی ہو یا کوئی اور ہو؟" کوّی بڑی بیچارگی سے کائیں کائیں کرنے لگی۔ "پھر بھی شکر ہے کہ کوئی نہ کوئی تو ہو تم جو بھی ہو، تم بھی نہ ہوتے تو میں تمھارا کیا بگاڑ لیتی؟ ـــــــ بس اس عورت کے مانند کاکا کو نہلانے کا کام اپنے ذمّے لے لیتی جہاں بھی چھوڑ جاؤ کاکا وہیں کا وہیں رہتا ہے۔"

تو جایا کرو اپنے کاکا ہی کے پاس۔" کوّے کو تاؤ سا آنے لگا۔ "پیٹ میں درخت کا اتنا بڑا انڈا ہو گیا تو دم نکل جائے گا۔" وہ غصّہ بھول کر اپنی بات پر کائیں کائیں کہنے لگا۔

"شرم کرو، کاکا کے بارے میں کیسی باتیں کرتے ہو؟"

"تو کیا ہوا؟"

کوّا اور کوّی اپنے گھونسلے سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک اس ٹہنی پر کہیں سے ایک ناگ رینگ آیا اور گھونسلے میں رکھے ہوئے کوّے کے انڈوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کائیں! ـــ کائیں! ـــ!" کوّی اس جانب دیکھ کر چیخنے لگی۔

"کائیں! کا ـــ!" کوّے نے مدد کے لیے پکار کی۔

لیکن سانپ زبان چاٹ چاٹ کر بڑے انہماک سے اپنے کام میں لگا رہا۔

"کائیں! کائیں! کائیں! کا ـــ!"

چڑے نے اپنی چڑیا سے کہا۔ "کوّے کی ذات کتنی بدتمیز ہوتی ہے! خواہ مخواہ شور مچا مچا کر ہمیں پریشان کر رہے ہیں ــــ جاہل ــــ آوارہ!"

"چھوڑو، تمھیں کیا؛ لڑائی بھی اُنھی سے کرنا چاہیے جو شریف اور مہذّب ہوں۔"

کبوتری نے اپنی آنکھیں بدستور بند رکھیں اور اپنے بندر سے کہنے لگی "کاکا سب اچھے بُروں کو یہاں ہنس کر جگہ دے دیتا ہے۔ ان کی کاکائیں سن کر مجھے ڈر لگنے لگتا ہے کہ تم بھی اپنی گٹ ــــ گوں، گٹ ..... گوں چھوڑ کر ایک دن اچانک کائیں کائیں شروع کردو گے۔"

اور کبوتر نے اس کی گردن میں اپنی گردن ڈال دی۔ "چپ چاپ اسی طرح پڑی رہو۔ ہمیں کیا لینا دینا ہے؟"

"کائیں! کائیں! کائیں! کا ــــ!"

سانپ نے زبان چاٹ چاٹ کر ٹوٹے پھوٹے انڈوں سے منھ موڑ لیا۔ ذرا رک کر، مسکرا کر کوّے کوّی کی جوڑی کی طرف دیکھا اور نیچے کی طرف رینگنے لگا اور جب کافی نیچے اُتر گیا تو کوّا کوّی اپنے گھونسلے کی طرف لپکے اور اپنے ٹوٹے پھوٹے انڈوں کے خالی خولی چھلکے دیکھ دیکھ کر آہ و زاری کرنے لگے۔ "کائیں! ــ کا ــ!"

کئی اور کوّے وہاں جمع ہو کر ان کے سوگ میں شامل ہو گئے۔

"ارے بھئی کیا ہو گیا ہے؟" پیپل کاکا شاید اپنے اندر گھسا ہوا تھا جو اتنی دیر اسے یہ چیخ پکار سنائی نہ دی۔

کوّوں کی برادری نے بہ یک زبان فریاد کی "کائیں!"

اور کاکا نے گھونسلے میں ٹوٹے ہوئے انڈوں کو دیکھا اور ابھی وہ کچھ سوچ ہی

رہا تھا کہ اپنے ٹخنے پر کسی کا رینگنا محسوس کرکے چونک پڑا۔

اسی اثنا میں کاکا کے چونکنے کے احساس سے کالے ناگ نے اس کا تنا ڈس لیا اور زہر سے کٹ کر اس کی کھال کا ایک ٹکڑا نیچے آگرا۔

کاکا نے ناگ کو اپنے پیروں تلے مسل دینا چاہا لیکن جوں کا توں کھڑا رہا کہ اس کے پیر ہی کہاں تھے؟

ناگ اپنی فتح یاب پھنکاریں بلند کرکے اچھل کر زمین پر آگیا اور سب کے دیکھتے اوجھل ہوگیا۔

کاکا غصّے سے دانت پیس پیس کر اپنی جڑوں سمیت اپنے وجود کے اندر ہی بھاگ رہا تھا لیکن سانپ تو کہیں باہر چھپا ہوا تھا۔ شاید اس سے دو ایک قدم پر چھپ کر اپنی زبان چاٹ چاٹ کر کاکا کی مجبوری پر ہنس رہا تھا کہ جس کا آدھا وجود زمین گڑا ہو وہ اتنا بڑا ہونے پر بھی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے، جب میرا جی چاہے گا اس پر جا چڑھوں گا۔ اپنی اسی جگہ گڑے گڑے اس کی کھال اتنی موٹی ہوگئی ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں کہ میں اس کے وجود پر مزے سے رینگ رہا ہوں، اپنے اندر ہی اندر پھیل پھیل کر خوش ہوتا رہتا ہے۔

"میں — میں —!" کاکا اپنے بارے میں سوچ سوچ کر غصّے سے کانپ رہا تھا اور اس سے جڑی ہوئی ساری شاخیں سائیں سائیں کر کر کے اس کی منت سماجت کر رہی تھیں اور ہوا تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کائیں! — کائیں! —"

کاکا کے ٹخنے کے قریب ایک چھوٹا سا پودا ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا اور

رہا تھا کہ جس نے منوں مٹی کی جکڑ سے آزاد ہو جانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

نئی نسل کے اس نمائندے کی تندی کاکا کو بھلی معلوم ہونے لگی اور وہ اپنے ٹخنے میں بیٹھ کر اس پودے سے گویا ہوا۔ ”ذرا اور زور لگاؤ میرے نو عمر دوست، ورنہ ابد تک تمھارے سینے پر سانپ لوٹتے رہیں گے ـــــ شاباش!۔ اور زور لگاؤ ـــــ مٹی سے باہر نکل کر تمھیں ظلم کا پیچھا کرنا ہے، دوڑ دوڑ کر جینا ہے! ـــــ شاباش! ـــــ اسی ایک جگہ پر اونچے ہوتے گئے تو اور پستی میں جا دھنسو گے، قیامت تک زندہ درگور رہو گے، مرے ہو گے لیکن تمھیں زندہ رہنا ہوگا، زندگی تمھاری سزا ہو گی! ـــــ شاباش! ـــــ!“

پیپل کاکا کی سب سے اونچی شاخ پر لٹکنے کے انداز میں بیٹھا کوئی الو دن دھاڑے قہقہے لگانے لگا جس سے تند ہواؤں کی سائیں سائیں سناٹے کا سماں باندھنے لگی۔

رتن سنگھ

پناہ گاہ

رات کو سویا تو میں اپنے کمرے میں تھا، اپنے پلنگ پر، لیکن صبح جب جاگا تو میں نے اپنے آپ کو اُس اندھیرے کمرے میں پایا، جسے میں پاکستان بنتے وقت اپنے ساتھ ہندوستان لایا تھا۔

اُس اندھیرے کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹا ہوا میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ موت کی وادی سے نکل کر محفوظ جگہ پر پہنچ گیا ہوں۔ رات کے آخری پہر میں، میں نے بڑا ہی بھیانک سپنا دیکھا تھا، جس میں خوفناک جانور مجھ پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سپنے میں ان بھیانک جانوروں سے بچنے کے لئے میں نے ہمیشہ کی طرح اس کمرے میں پناہ لی تھی۔

سپنا ٹوٹ گیا تھا۔ میں پوری طرح جاگ رہا تھا، دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا، لیکن اُس کمرے کی فضا میں ایک لطیف سی گرمی تھی، جو خوف سے ٹھٹھرتے ہوئے میرے جسم کو راحت بخش رہی تھی۔ اُس کمرے کی بُو باس میں ایسی خوشبو تھی جو

میری سانسوں کے ذریعہ میرے وجود میں تحلیل ہو کر دل و جان کو سکون عطا کر رہی تھی اور اُس کمرے کی چاروں دیواروں نے جیسے میرے زخمی وجود کو باہیں پھیلا کر اپنی آغوش میں لے لیا تھا، اور مجھے اُس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے اُس کمرے کی چاروں دیواروں نے میری کائنات کو احاطے میں کر لیا ہو اور اُس احاطے میں کوئی خوف نہ رہا ہو، کوئی دکھ نہ رہا ہو اور اُن دیواروں پر ٹکی ہوئی چھت مہربان آسمان کی طرح مسکرا رہی تھی۔

اُس اندھیرے کمرے کو پاکستان سے اٹھا لانے کا قصّہ یوں ہے کہ جب وقت کا وہ ظالم لمحہ قریب آیا جس کے ایک ہی وار نے صدیوں پرانے رشتے کو کاٹ کر رکھ دیا تھا تو گھر میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ گاؤں کا لمبا تڑنگا نمبردار مُراد علی آنگن میں کھڑا ہم سب کے گھر سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے آتے ہی کہا تھا "جلدی چلو تڑ تڑ، سارے ہندو بازار میں اکٹھا ہو رہے ہیں، وہاں سے فوراً ہی چل دینا ہے، راوی پار کرنے کے لیے!"

اُس وقت میری دادی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اُس نے آٹا وہیں کا وہیں چھوڑا۔ ہاتھ دھو کر جلدی سے دوپٹہ بدلتے کسی کمرے میں گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں کسی کو کیا سوجھ سکتا تھا کہ کیا اُٹھائے۔ پھر بھی جیسے سارا گھر اس لمحے کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میرے بڑے کے ہاتھوں میں اُس کے اسکول کالج کے سرٹیفکیٹ تھے۔ میرے باپ کے ہاتھوں میں زمینوں کی ملکیت کے کاغذات تھے۔ چھوٹے اوتار نے سب کی دیکھا دیکھی اپنا اسکول کا بستہ اٹھا لیا تھا اور میری دادی کے ہاتھوں میں چاندی کے زیوروں اور برتنوں کی خاصی بڑی پوٹلی تھی، جو صرف اس لیے تیار کی گئی تھی کہ

لُوٹنے والوں کی نظر ہمارے سونے کے اُن زیورات کی طرف نہ جائے جو ہم نے جوتوں کے تلوؤں اور جسم کے دوسرے حصّوں میں چھپا رکھے تھے ــــــ!

جب دادی دوپٹہ اوڑھ کر باہر آئی تو اُس کے ہاتھوں میں پکڑی چاندی والی پوٹلی نمبردار نے لے کر اپنی بغل میں دبالی۔ اور پھر وہ میرے والد کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا کہ کہیں اُن میں نوٹ تو نہیں چھپائے ہیں۔

میں چھت کے اوپر سے گھبراہٹ کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ دل کرتا تھا کہ ایک اینٹ دیوار سے اُکھاڑ کر نمبردار کو اس طرح کھینچ کر ماروں کہ اُس کی طُرّے دار پگڑی کے نیچے چُھپا ہوا سر دو پھاڑ ہو جائے۔ لیکن ہمارے گھر کی دیواریں بڑی مضبوط تھیں۔ ویسے بھی اُس وقت اینٹ اُکھاڑ کر مارنا نہ تو ممکن ہی تھا اور نہ ہی عقل مندی۔

اس لئے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی ـــ اور میں گھبرایا ہوا سارے مکانوں میں پاگلوں کی طرح گھومنے لگا۔ اس کمرے سے اُس کمرے تک دالان سے رسوئی تک۔ مجھے کوئی بھی ایسی چیز سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جسے نمبردار کی تیکھی نظروں سے چھپا کر ساتھ لے جایا جا سکے۔ اور پھر وقت کہاں تھا ــــــ؟

وقت تو موت کا رُوپ دھار کر مُراد علی کی شکل میں گھر کے آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اور گھر سے نکلنے والے ایک ایک شخص کی تلاشی لے رہا تھا۔ ایسی حالت میں بھلا میں اُس گھر سے چلتے وقت کیا اُٹھا سکتا تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھبرایا ہوا اُس اندھیرے کمرے میں گیا۔ اُس کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر ایک پل کے لیے لیٹا اُس کی بو باس کو اپنے وجود میں رچایا، اُس کی دیواروں کو اپنے گرد

کھڑا کیا اور پھر چھت سمیت اُسے اٹھا کر جلدی جلدی سیڑھیاں اُترنے لگا کیوں کہ مُراد علی اونچی آواز میں مجھے پکار رہا تھا کہ جلدی آؤ چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔

اِس وقت اتنے سال گزر جانے کے بعد اگر آپ اِس کمرے کا صحیح حدود اربعہ دیکھنا چاہیں تو لاہور سے نارووال جانے والی گاڑی پر بیٹھئے۔ نارووال سے پہلے ایک اسٹیشن پڑتا ہے، بیجووالی۔ اس اسٹیشن پر اتر کر آپ کو دو میل پیدل چلنا ہوگا۔ داؤد نام کے گاؤں پہنچنے کے لئے جو دریائے راوی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ گاؤں کے باہر ہی جھنڈے شاہ کا ڈیرہ ہے۔ اس ڈیرہ کے پیچھے مستری مول چند کی بیٹھک کے سامنے ایک تنگ سی گلی ہے، چھوٹی سی۔ اس کے عین سرے پر ہمارا مکان ہے جہاز نما بڑا سا۔

اُس وقت اِس گھر میں دو خاندان رہتے تھے۔ ہمارا اور ہمارے چچا کا۔ لیکن گاؤں والوں کے لیے یہ ایک ہی گھر تھا، ایک ہی خاندان۔ وجہ یہ کہ نہ تو ان دونوں خاندانوں کے درمیان زمین کا ہی بٹوارہ ہوا تھا اور نہ ہی گھر کے اندر تقسیم کی دیواریں اُٹھتی تھیں کھیتوں کی فصل ایک ساتھ گھر میں آتی تھی اور پھر باہر کی ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرنے کے بعد آدھا اناج چچا کے کمروں میں چلا جاتا اور باقی آدھا ہمارے کمرے میں۔ اس پر لطف یہ کہ باہر سے آنے والے مہمان گھر میں دو دو مہینے رہ جاتے اور کسی کو یہ پتہ نہ چلتا کہ دسترخوان پر رکھا ہوا کھانے کا سامان دو رسوئیوں سے، دو گھروں سے بن کر آیا ہے۔ وہ سب یہی سمجھتے کہ دونوں بھائی، بڑی محبت سے مل جل کے رہ رہے ہیں۔

ہاں تو اِسی گھر میں وہ اندھیرا کمرہ ہے، جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اس میں پہنچنے کے لیے، سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر جائیں گے تو آنگن سے گزرنے کے بعد ایک بہت بڑا دالان ملے گا۔ اس دالان کے ایک، دو، تین، چار ہاں پانچ دروازے تھے اور سامنے

کی طرف روشن دان تھے۔ نہیں آٹھ تھے، کیوں کہ اس دالان کے دوسرے سرے پر چچا کی بہت بڑی رسوئی تھی اور وہاں پر کوئی روشن دان نہیں تھا۔ اس دالان کے پیچھے دو کمرے تھے۔ دائیں طرف والا چچا کا اور بائیں طرف ہمارا۔

ہمارے اس پچھلے کمرے میں چونکہ باہر کی طرف کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی، اس لیے اس میں قدرے اندھیرا رہتا تھا۔ دالان کے سامنے والے دروازے کھول دینے پر جتنی روشنی آجائے۔ اس کے علاوہ روشنی کا کوئی گذر اس میں نہیں تھا، اسی لیے اس کمرے کے طاق میں ایک سرسوں کا دیا رکھا رہتا تھا، جو ضرورت کے وقت جلا لیا جاتا۔ اس کی مدھم سی پیلے رنگ کی روشنی میں یہ کمرہ اور بھی خوبصورت ہو جاتا تھا۔

ویسے تو مجھے بچپن میں اندھیرے سے بہت ڈر لگتا تھا اور نچلی منزل پر اس کمرے کے نیچے جو کمرہ ہے، میں اس میں جاتے ہوئے بھی گھبراتا تھا لیکن بچپن سے ہوش سنبھالتے ہی پتہ نہیں کیوں میں نے اس کمرہ کو اپنی پناہ گاہ بنا لیا تھا۔

گرمی کے دنوں میں دادی خود صبح اٹھتے وقت مجھے بھی کچی نیند سے جگا دیتی تو چھت سے اتر کر میں اسی کمرے میں چھپ کر سو رہتا تھا اور چھت پر صبح کی خنکی کے بعد اس کمرے کی گرم گود میں بڑی میٹھی نیند آتی تھی۔

پھر یہ تھا کہ گرمیوں کی برسات کے بعد جب ہلکے جاڑے پڑنے شروع ہوتے تو ہمارے گھر کے نچلے حصہ کی پچھلی اندھیری کوٹھریوں سے کبھی کبھی سانپ نکل آتا تھا۔ وہ سانپ چاہے مار ہی دیا جاتا لیکن اس کی دہشت اس قدر طاری ہوتی تھی کہ مجھے گھر کے نچلے حصے سے ڈر لگنے لگتا تھا۔ میں ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے فوراً بعد

سیڑھیوں کے راستے چھت پر پہنچ جاتا اور جب تک اس پچھلے کمرے میں نہ پہنچ جاتا، مجھے ایسا لگتا جیسے ہر قدم پر سانپ میرا پیچھا کر رہا ہو۔ اور اگر جلدی نہ کی تو وہ میری راہ روک لے گا یا ٹانگوں سے لپٹ جائے گا۔

یہ کمرہ ایک اور وجہ سے بھی میرے لیے دوست کا کام کرتا تھا۔ میری آپنی دادی بڑی سخت مزاج عورت تھی۔ بچپن میں ذرا ذرا سی غلطی پر ایسی سخت سزا دیتی تھی کہ روئی کی طرح ٹوم کر رکھ دیتی تھی۔ دادی سے مار کھانے کے بعد جب روتا روتا میں اس کمرے میں، پچھلے پلنگ پر اوندھے منہ لیٹتا تو اس کمرے کی بو باس جیسے میری چوٹوں پر مرہم پٹی کا کام کرتی۔ اس کمرے کی دیواروں کی خنکی میرے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی اور ایسے موقعوں پر اسی کمرے میں میری دوسری دادی یعنی چاچا کی ماں میری دادی سے چوری چوری مجھے دودھ کا گلاس پلا دیتی۔ دودھ کا گلاس جس کا چوتھائی حصہ بالائی سے بھرا ہوتا ــــ!

گھر کے اندر پیدا ہونے والے خوف اور ڈر کے مارے تو یہ کمرہ پناہ گاہ کا کام دیتا ہی تھا، لیکن گھر کے باہر بھی جتنے خطرے آتے تھے، ان سے بھاگ کر مجھے اسی کمرے میں چین پڑتا تھا۔

ہمارے گاؤں میں دوسرے تیسرے سال باڑھ آجاتی تھی۔ راوی کا پانی اپنے کناروں کو توڑ کر ہمارے گاؤں کو جب کالے ناگ کی طرح گھیرتا تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا۔ ہماری گلی کے سامنے جو چوڑا راستہ جاتا ہے، وہاں تو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہوتا، لیکن ذرا آگے بڑھو تو یہی پانی گلے سے بھی اوپر جاتا۔ ایسی باڑھ کے وقت پانی کی تیز دھاروں کی شائیں شائیں سے سارے گاؤں پر دہشت چھا جاتی۔ ہر شخص

گھبرایا ہوا ہوتا۔

میں یہ ہولناک منظر دیکھ کر گھر لوٹتا تو اس کمرے میں چھپ جاتا۔ جیسے مجھے یقین تھا کہ باڑھ کا پانی اس کمرے کی بلندی تک نہیں پہونچ سکتا۔ جب میرے دل کو ذرا سی دھیرج بندھتی تو ایسے موقعوں پر میں سوچتا کہ کاش اِس کمرے کی دیواریں اتنی بڑی ہو جائیں، اتنی بڑی ہو جائیں کہ سارا گاؤں اس میں سمٹ جائے۔ باڑھ کی زد میں آکر لہلہاتی فصلوں والے کھیت برباد ہو جاتے تھے اور کچّی دیواروں والے بھنگیوں اور کمہاروں کے مکان اکثر باڑھ کی وجہ سے گر جایا کرتے تھے۔ اسی لیے میرے دل میں آیا کرتا کہ یہ سب اِسی کمرے میں آکر سما جائیں یا یہ کمرہ ہی اتنا بڑا ہو جائے کہ یہ سارے مکان، سارے کھیت اِس کے اندر آکر باڑھ سے محفوظ ہو جائیں۔

اب تو آپ کو تھوڑا بہت اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ اس کمرے کی میرے لیے کیا اہمیت ہے اور میں اِسے پاکستان سے اٹھا کر کیوں لایا تھا۔ اِس نئی دھرتی پر چونکہ ابھی تک کہیں میرے قدم جم نہیں پائے، اس لیے میں شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتّے کی طرح لڑھکتا پھرتا ہوں۔ حوادث کی ہوا جب میری مرضی کے خلاف مجھے ڈھکیل کر انجانی سمتوں میں لے جاتی ہے اور انجان راہوں پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے جب میرا وجود لہو لہان ہو جاتا ہے تو میں خود بخود اس کمرے میں پہنچ جاتا ہوں چند لمحے کے لیے —— اور اس کے طاق میں رکھے دیئے کو میں جیسے ہی روشن کرتا ہوں، اس کی پیلی روشنی میں میری تڑپتی ہوئی روح کو قرار آنے لگتا ہے۔

یاں یوں کہیئے کہ جب حقیقی زندگی کے خوف میرے گرد پھیلے ہوئے اندھیروں سے نکل کر کالے ناگ کی طرح پھن پھیلا کر میرا راستہ روک لیتے ہیں یا میرے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں...... یا پھر دکھوں اور غموں کی باڑھ اپنی ساری حدوں کو توڑ کر جب میری ہستی کو اس طرح گھیر لیتی ہے جیسے راوی ہماری ساری بستی کو گھیر لیا کرتی تھی اور جب میرے وجود کے گرد کچی دیواریں وقت کی بے رحم لہروں کی زد میں آکر گرنے لگتی ہیں تو میں اپنے آپ کو بچانے کے لیے اسی کمرے میں پناہ لیتا ہوں۔ اِسی کمرے میں جو میں پاکستان سے اٹھا کر اپنے ساتھ لایا تھا۔ جب موت مراد علی کا روپ دھار کر میری زندگی کی چاندی چھیننے آتی ہے تو میں ڈر کے مارے سہما ہوا پاگلوں کی طرح چاروں طرف گھومتا ہوں اور پھر اسی کمرے میں دبک کر چند لمحے سکون پاتا ہوں۔

ایسے موقعوں پر اس کمرے کی بو باس میرے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھتی ہے، میری سانسوں کے ذریعے جسم کے اندر داخل ہو کر دھیرج دیتی ہے اور اس کمرے کی چاروں دیواریں مجھے اپنی آغوش میں لے کر زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتی ہیں اور کمرے کی چھت مہربان آسمان کی طرح رحمت کی بارش کرنے لگتی ہے۔

جب کبھی باڑھ آتی تھی تو اپنے بچپن میں اس کمرے میں لیٹا ہوا میں یہ دعائیں مانگا کرتا تھا کہ یہ کمرا سارے گاؤں، ساری بستی کی پناہ گاہ بن جائے اور اب بڑا ہو کر میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر اس کمرے کی دیواریں۔

ساری دنیا کو اپنے احاطے میں لے لیں تو ہو سکتا ہے کہ اس کی مہربان چھت کے نیچے اس دکھی دُنیا کو چند لمحوں کے لیے سکون میسّر ہو جائے۔

اِسی مقصد کے حصول کے لیے میں اکثر اس اندھیرے کمرے میں پہنچ کر اس کے طاق میں رکھے دیئے کو روشن کرتا ہوں اور اس کی جلتی ہوئی لَو کی طرف دیکھتا رہتا ہوں ایک ٹک اور سوچتا ہوں کہ اس کی لَو کو کیسے اور تیز کیا جائے کہ اس کی پیلی روشنی ساری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لے۔

عابد سہیل

سوا نیزہ پر سورج

لکھنؤ کے نام دوسری کہانی

میری بڑی بیٹی سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "کھیل چکیں؟"

"کیا کھیلیں؟" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر ہوا میں جھلا دیے۔

"کیرم کیوں نہیں کھیلتیں؟"

"آپ تھوڑی دیر بعد کہیں گے تم لوگ شور کرتے ہو ——— اور پھر شگوفہ کھیلنے بھی تو نہیں دیتی ——— تھوڑی تھوڑی دیر بعد سب گوٹیں گڈ مڈ کر دیتی ہے۔ خود تو کھیلنا آتا نہیں ہمیں بھی نہیں کھیلنے دیتی۔"

"بچی ہے۔" میں نے کہا۔ "اپنی چھوٹی بہن کا خیال تو کرنا ہی چاہیے۔" میں نے اپنے حساب سے سارا جھگڑا چکا دیا۔

"تو ہم کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ہم بھی تو بچے ہیں۔" فوزیہ نے

سادگی اور بھولے پن سے کہا۔

میں نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ واقعی ابھی تو وہ بھی بچی ہی تھی۔ اس سے یہ اُمید کرنا کہ چھوٹے بھائی بہنوں کے جھگڑے چکائے، چھوٹا بہن کیرم کی گوٹوں کو کھیل کے درمیان بار بار بگاڑ دے تو غصہ ہونے کے بجائے انھیں پھر سے اپنی جگہ رکھ کر اسے سمجھائے اور منائے۔ اس کے ساتھ ذرا زیادتی ہی تھی۔ اس لیے میں نے کہا۔

"تو تم دونوں لوڈو کیوں نہیں کھیلتے۔"

"صبح تو کھیلا تھا۔"

"تو اور کھیلو۔"

"اور کیا کھیلیں؟" وہ منمنائی۔ "صبح جب سیف ہارنے لگے تو خفا ہو کر الگ بیٹھ گئے۔ بولے۔ آپ ہمیشہ ہرا دیتی ہیں ضرور بے ایمانی کرتی ہیں۔"

"تو ایسا کرو۔" میں نے ایک ترکیب نکالی۔ "خود تو چار گوٹوں سے کھیلو اور اس کو دو گوٹوں سے کھیلنے دو۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"ہو گا یہ کہ تم اچھا کھیلتی ہو۔ تم تو جیتو گی ہی۔ اس طرح ممکن ہے سیف بھی کبھی جیت جائے۔ اس کی بھی خوشی ہو جائے گی۔"

"اس میں اچھا کھیلنے کی کون سی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "یہ تو قسمت کی بات ہے۔ پانسہ میں جو بھی نمبر آ جائے ـــــ بڑے چھوٹے سے اس کا کیا تعلق؟"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی کیا ابو؟" ـــــ وہ پانسہ ڈالیں تو گن کر ان کی گوٹ بھی آگے بڑھاؤ۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ ان کی گوٹ نہ پٹنے پائے۔ اس پر بھی ہار جائیں تو منہ پھلا کر بیٹھ جائیں۔"

سچ پوچھیے تو فوزیہ کی دلیل میں وزن تھا اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دوں کہ اتنے میں سیف میاں دوسرے کمرے سے آ گئے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو مجھے دیکھتے ہی بہہ نکلے۔

" ابو دیکھیے، گڑیا ہمارے ساتھ کھیلتی نہیں۔" یہ کہہ کر سیف جو ہمیشہ فوزیہ کو گڑیا ہی کہتے تھے بھوں بھوں رونے لگے۔

فوزیہ نے جب دلیل کو آنسوؤں سے ہارتے دیکھا تو وہ بھی رونے لگی۔

●

تھوڑی دیر بعد تینوں بھائی بہن پھر ایک جگہ مل جل کر کھیلنے لگے۔ کھڑکی سے جھانک کر میں نے دیکھا تو آنگن کے دوسری طرف باورچی خانہ کے پاس والے دالان میں ان کھلونوں کی، جو امتحانات ختم ہونے کے بعد دوبارہ بچوں کے قبضہ میں آ گئے تھے بارات سجی تھی۔ چھوٹی چھوٹی اینٹوں کو چولھا بنایا گیا تھا جس پر ایک چھوٹی سی پتیلی میں کھانا پک رہا تھا۔ سامنے گڈے گڑیوں کا صوفہ سیٹ سجا تھا، بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ صوفوں پر آمنے سامنے گڈے گڑیا بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے میز پر ٹین کی پھول دار رنگین پلیٹیں رکھی تھیں جن میں بسکٹ اور گگڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھے تھے۔ ٹین کی رنگین کیتلی اور چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طشتریاں قرینے سے میز پر سجی تھیں۔ فوزیہ نے پتیلی پر سے طشتری اٹھا کر

چمچے سے ایک آلو نکالا اور اسے دو انگلیوں سے دبا کر دیکھا اور بولی "ابھی کچے ہیں" تو شگوفہ نے گڑیا گڈے کی طرف دیکھ کر کہا "ابھی کھانے میں تھوڑی دیر ہے۔ آپ لوگ جب تک ناشتہ کیجیے۔"

میں اپنی ہنسی بمشکل ہی ضبط کر سکا۔ وہ اپنے کھیل میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں اس بات کا اندازہ بھی نہیں ہوا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں ورنہ فوزیہ وہیں سے کہتی "ابو اللہ آپ اندر جائیے۔ دیکھیے ہم تو آپ کا کھیل نہیں دیکھتے ہیں۔"

میں مطمئن ہو کر کمرہ میں چلا آیا۔ بیوی کسی عزیزہ کے یہاں گئی ہوئی تھیں جو یکایک شدید بیمار ہو گئی تھیں۔ اُس گھر میں دو بچوں کے خسرہ نکلا تھا اس لیے تینوں بچوں کو گھر پر ہی چھوڑ گئی تھیں۔ ان عزیزہ کا گھر کافی فاصلہ پر تھا۔ آتے جانے میں تین چار گھنٹے تو لگیں گے ہی —— میرے لیے تینوں بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا یہ پہلا تجربہ تھا اس لیے شروع میں تو گھبرایا تھا، کچھ اُلجھا بھی تھا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ میری پریشانی بلا سبب تھی۔ ویسے بھی اب بیوی کو گئے، ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے اور اب وہ واپس آتی ہی ہونگی۔

یہ سوچ کر میں نے پلنگ پر دراز ہو کر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی میں بمشکل دو تین چیزیں ہی پڑھ سکا تھا کہ سیف میاں روتے ہوئے آئے۔

"ابو گڑیا آپا بڑی خراب ہیں اپنی گڑیا کو دو دو پیالیاں چائے پلاتی ہیں اور میں نے کہا کہ ہمارے گڈے کو بھی ایک پیالی اور بنا دو تو بولیں جانتے ہو شکر کتنی مہنگی ہے۔ آپ تو کل کہہ رہے تھے کہ شکر سستی ہو گئی ہے۔"

میں ہنسی بڑی مشکل سے روک سکا۔ پھر میں نے فوزیہ کو آواز دی۔

"فوزیا!"

"جی ابّو۔"

"سنو۔"

"آئی۔" کہتی ہوئی وہ آ براجی۔

"کیوں جی۔ تم سیف کے گڈّے کے لیے چائے کی دوسری پیالی کیوں نہیں بنا دیتیں؟"

"ابّو آپ جانتے نہیں۔ یہ بڑے حضرت ہیں۔ پہلے بولے ہمارا گڈّا بسکٹ اور ککڑی زیادہ کھائے گا۔ اسے بھوک لگی ہے۔ تم اپنی گڑیا کو دو پیالی چائے پلا دینا۔ میں نے بسکٹ اور ککڑی کا چھوٹا سا ایک ٹکڑا اپنی گڑیا کو دیا اور باقی سب ان کے گڈّے کو دے دیا۔ اب چائے بھی دوسری پیالی مانگ رہے ہیں۔"

"لیکن گڈّے گڑیا تو کچھ کھاتے نہیں وہ بسکٹ اور ککڑی ہوئے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہوئے کیا ——؟ خود کھا گئے" فوزیہ بولی۔

"اور تم نے نہیں دوسری پیالی چائے پی لی —— اور بسکٹ اور ککڑی بھی تو کھائی تھی تم نے ——" سیف رو دیا۔

اسی لمحہ شگوفہ ایک ہاتھ میں کھلونے والی طشتری پیالی اور دوسرے میں بسکٹ اور ککڑی کے دو چھوٹے ٹکڑے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس طرح سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی کہ اگر ذرا بھی تیزی سے چلی تو چائے کی پیالی چھلک جائے گی۔

" اچھا تو یہ آپ کا حصّہ ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا اور دھیرے سے پیالی اور طشتری تخت پر چھوٹے سے ٹین کے چمچہ سے پیالی میں، جو بالکل خالی تھی، شکر چلانے لگی۔

" بھئی اس میں چائے تو ہے ہی نہیں۔" میں نے کہا۔

" جھوٹ موٹ"۔ کہہ کر اس نے پیالی میرے منہ سے لگادی۔

" بڑے مزے کی ہے"۔ میں نے کہا تو فوزیہ بھی مسکرادی لیکن مجھے اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر اس نے منہ دوسری طرف کرلیا۔ سیف اب بھی روہانسے تھے۔

اصل میں یہ لوگ صبح سے کھیلتے کھیلتے تھک چکے تھے۔ آخر کھیلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئے پندرہ بیس دن ہوچکے تھے۔ شروع میں تو ان لوگوں نے چھٹیوں کے خوب مزے لیے۔ رنگ برنگی تصویروں کی ہندی۔ اُردو اور انگریزی کی جو بہت سی کتابیں میں نے منگا کر رکھی تھیں انھیں دو دو نہیں چار چار بار پڑھ ڈالا۔ پھر کئی دن بغیر لڑے جھگڑے کھیلتے رہے۔ اب کئی دن سے ان سے ہر روز پوچھا جارہا تھا کہ اسکول کھلنے میں کتنے دن باقی ہیں اور ہر کھیل کا خاتمہ بھی لڑائی پر ہونے لگا تھا۔

ایک دم مجھے خیال آیا کہ ملحقہ مکان کی بچی نازو بہت دنوں سے نظر نہیں آتی اور یہ لوگ بھی اس کے یہاں نہیں گئے۔ میں نے کہا۔

" اب تم لوگ نازو کے ساتھ نہیں کھیلتے۔"

" جب سے جھگڑا ہوا ہے ان کی دادی آنے ہی نہیں دیتیں ہمارے یہاں!" فوزیہ نے کہا۔

"تو تم لوگ چلے جایا کرو۔"

"امی نے منع کر دیا ہے۔"

خالی چرخی ہاتھ میں تھی اور پتنگ آسمان پر ــــــ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا تو میں نے کہا، "اچھا اب تم لوگ سو جاؤ۔"

"امی کب آئیں گی؟" شگوفہ نے پوچھا۔

"اب آتی ہی ہوں گی۔" میں نے تسلی دی۔

"جب امی آجائیں گی تب سوئیں گے مزے سے۔"

"نہیں۔" میں نے "نہیں" کی "ی" کو ذرا کھینچ کر مصنوعی غصہ سے کہا۔ "بس لیٹ جاؤ۔ لُو چلنے لگی ہے۔ اب دالان میں کوئی نہیں کھیلے گا۔"

میرے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر تینوں لیٹ گئے۔ فوزیہ اور سیف تخت پر اور شگوفہ میرے پاس مسہری پر۔

"آنکھیں بند۔" میں نے کہا تو تینوں بچوں نے آنکھیں بند کر لیں اور میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کھسر پھسر کی آواز سن کر میں نے اخبار آنکھوں کے سامنے سے ہٹایا تو فوزیہ اور سیف شرارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"سو جاؤ ــــــ" میں نے ذرا سختی سے کہا۔

دونوں نے خوب کس کے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن شریر مسکراہٹ ان کے چہروں پر اب بھی کھیل رہی تھی۔ پھر یہ اخبار پڑھنے لگا اور نہ جانے کب میری

آنکھ لگ گئی۔

تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھلی تو تخت خالی تھا۔ مسہری پر شگوفہ بھی نہ تھی۔ میں کچھ دیر تک اسی طرح بستر پر لیٹا رہا۔ شاید اس انتظار میں کہ کسی کی آواز سنائی دے تو بلاؤں، لیکن نہ کسی بچے کی آواز سنائی دی نہ یہ اندازہ ہی ہوا کہ وہ کہاں ہیں۔

میں دھیرے دھیرے بستر سے اُٹھا۔ سامنے والا دالان خالی پڑا تھا۔ کھلونے، صوفہ سیٹ سب اسی طرح سجے تھے۔ اب مجھے ذرا تشویش ہوئی، لیکن صدر دروازہ اندر سے بند دیکھ کر میری تشویش کچھ کم ہو گئی۔ دوسرے کمرہ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دراز سے جھانکا۔ تینوں بچے کمرہ میں موجود تھے۔

شگوفہ فرش پر دراز تھی۔ اس کا کرتا اوپر تک اٹھا تھا اور پیٹ پر پٹی بندھی تھی جس میں سے خون کی چھینٹیں جھانک رہی تھیں۔ میں گھبرا گیا لیکن پاس والی میز پر لال روشنائی کی دوات الٹی پڑی اور سارا میز پوش رنگا دیکھ کر میری گھبراہٹ تو دور ہو گئی لیکن معاملہ کیا ہے یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ شگوفہ کے پاس ہی ترکاری کاٹنے والی چھری ایک پھٹے سے کپڑے پر رکھی ہوئی تھی۔ کپڑا جگہ جگہ سے سُرخ ہو گیا تھا۔ سیفی لکڑی کی ایک کھپچی جس کے ایک سرے پر کپڑا لپٹا ہوا تھا ہاتھ میں پکڑے کھڑا ہوا تھا اور فوزیہ سے کہہ رہا تھا۔

"مٹی کا تیل تو اسٹوو میں ہے اور اسٹوو مل ہی نہیں رہا ہے"۔

وہیں ہوگا ——— کچن میں الماری کے نیچے دیکھو۔"

"اچھا" کہہ کر سیف نے دروازہ کھولا تو مجھے دیکھ مسکرائے اور پھر فوراً ہی کمرہ میں لوٹ گئے۔ میں بھی کمرہ میں داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر شگوفہ بھی فرش پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

فوزیہ نے میری طرف دیکھا اور پلک جھپکائے بغیر بولی "ہم لوگ شیعہ سنّی لڑائی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔"

سریندر پرکاش

بجوکا

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھووں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھردرے گوشت میں سے ابھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جو اب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلہ میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے، بس ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ بھی ہوا تھا —— اور بوڑھے ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی۔ اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا زمین کا سینہ چیرتا ہوا

ہوا آگے بڑھ گیا۔

اُن دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے اُن کے پانچ بچے۔ تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلہ میں مارے جانے والے کے۔ اب اُن سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا، اور اُس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اُس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سُرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنوئیں کے گرد پانچوں بچے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہا رہے تھے۔ اُس کی بڑی بہو کنوئیں سے پانی نکال نکال کر اُن پر باری باری انڈیلتی جا رہی تھی۔ اور وہ اُچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اُچھال رہے تھے —— چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیزی میں ڈال رہی تھی اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

”سب تیار ہیں۔؟“ اُس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

”ہاں باپو —— “ سب بچے ایک ساتھ بول اٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلّو درست کیے اور اُن کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیار نہیں تھا —— سب جھوٹ بول رہے تھے —— اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے۔ اگر بھگوان نے جھوٹ جیسی نعمت

نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ اُن کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اُسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے پوتیاں اور بہوئیں ـــــ ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تن دہی سے جُٹ گئیں۔ جب تک ہوری ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے ـــــ اور وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

اُن کا کھیت لہلہا اٹھا تھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت میں پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنا اچھا سمے پہنچا ہے۔ نہ اہلمد کی دھونس نہ بنیے کا کھٹکا نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصہ ـــــ اُس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اُٹھے۔

"چلو باپو"، اُس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی، باقی بچے اُس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔

بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آگئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو

آجا رہے تھے۔ سب کے دلوں میں مسرت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکی فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اُس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے ــــ جو جیپ گاڑی کے پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں، جیسی کہ غریب کسان کی بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریب جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنا لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کُھلے کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کتا بے فکری سے سویا ہوا تھا۔ د. رطویلے میں کچھ گائیں، بھینسیں اور اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے ــــ ان سب کھیتوں کے بعد ذرا دور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا۔ جس میں جھونا یک کر انگڑائیاں لے رہا تھا۔

وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے سوکھی گھاس پر رینگ رہے ہوں ــــ وہ سب اپنے کھیت کی طرف جا رہے تھے جس کے آگے تھل تھا۔ دُور دُور تک پھیلا ہوا، جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی۔ بس تھوڑی بے جان مٹی تھی ــــ جس میں پاؤں

رکھتے ہی دھنس جاتا تھا ___ اور مٹی یوں بھر بھری ہو گئی تھی جیسے اس کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا' جب تک بچے جوان ہوں وہ تھل اُس کے کھیت تک نہ پہنچے۔ اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصّہ بن چکا ہوگا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اُس پر ہوری اور اُس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں......

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔

چلتے چلتے اُن کے پاؤں مٹی سے اَٹ گئے تھے۔ کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے، وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انھوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام بہنے کو بھی نہ تھا۔ اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب و غریب نقش و نگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے ___ اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آرہا تھا۔ سب کا دل بلیوں اُچھلنے لگا ___ فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھری اناج سے۔ پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ اُن سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رُک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری کو اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے۔ کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی لہر پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

"ابے کون ہے.... رے .... رے ـــــ؟"

اور پھر سب نے دیکھا کہ ان کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے ـــــ اب وہ سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلّایا۔

"ابے کون ہے رے ـــــ بولتا کیوں نہیں ـــــ کون فصل کاٹ رہا ہے میری ـــــ؟"

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آچکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سراپ سراپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمّت سے للکارا۔

"کون ہے حرام کا جنا ـــــ بولتا کیوں نہیں؟" اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سونت لی۔

اچانک کھیت کے پرلے حصّے میں سے ایک ڈھانچا سا اُبھرا اور جیسے مسکرا کر اُنھیں دیکھنے لگا ہو ـــــ پھر اُس کی آواز سُنائی دی۔

"میں ہوں ہوری کا کا ـــــ بجّو کا!" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھُٹی گھُٹی چیخ نکل گئی۔ ان کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی ـــــ کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آگئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے ـــــ وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یُگ ـــــ اس کا اُن میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصّہ سے کانپتی ہوئی آواز نہ سُنی اُنھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

"تم ...... بجوکا ...... تم۔ ارے تم کو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا ـــــ پھانس کی پھانکوں سے اور تم کو اُس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرہ میرے گھر کی بے کار ہانڈی سے بنا تھا اور اُس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان پُتلا میری فصل کاٹ رہا ہے؟"

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اور بجوکا بدستور ان کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا ـــــ جیسے اُس پر ہوری کی کسی بات کا اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے اُنھوں نے دیکھا ـــــ فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے۔ اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آگئی ـــــ وہ کئی مہینوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا مگر آج ...... وہ آدمی لگ رہا تھا ـــــ گوشت پوست کا اُن جیسا آدمی ـــــ یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اُٹھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر اُسے

ایک زوردار دھکا دیا ـــــ مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا ـــــ سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پہ ہاتھ رکھے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ سب نے اُسے سہارا دیا۔ اور اُس نے خوف زدہ ہو کر بجوکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو مجھ سے بھی طاقت ور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے ..... ؛ جس نے تمھیں اپنے ہاتھوں سے بنایا ـــــ اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے"

بجوکا حسبِ معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا "تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کاکا۔ میں نے تو صرف اپنے حصّے کی فصل کاٹی ہے۔ ایک چوتھائی ـــــ"

"لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچوں کا حصہ لینے کا۔ تم کون ہوتے ہو"

"میرا حق ہے ہوری کاکا ـــــ کیوں کہ میں ہوں ـــــ اور میں نے اس کھیت کی حفاظت کی ہے"

"لیکن میں نے تو تمھیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا۔ اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ـــــ یہ تمھارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آگئی ؟"

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا "تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔ خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو ـــــ"

"لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی ـــــ ؟ میں نے تو نہیں دی تھی"

"یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی ـــــ جس دن تم نے مجھے بنانے کے لئے بانس کی پھانکیں چیری تھیں، انگریزی شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بیکار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منہ بنایا تھا ـــــ اس دن اُن سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی

تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی ــــ اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں نے تمھاری امانت میں خیانت نہیں کی ــ میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا۔ اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو ــ میں نے اپنا حصہ کاٹ لیا، اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے"۔ بجو کانے آہستہ آہستہ سب کہا ــ تاکہ اُن سب کو اس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سازش ہے۔ میں تمھیں زندہ نہیں مانتا۔ یہ سب چھلاوا ہے۔ میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔ تم درانتی پھینک دو۔ میں تمھیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا ــــ" ہوری چیخا اور بجو کانے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

●

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی ــ۔ پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور بجو کا کا انتظار تھا۔ آج پنچایت کو اپنا فیصلہ سنانا تھا۔ مقدمہ کے دونوں فریق اپنا اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجو کا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا ــــ سب کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُسے لگا جیسے بجو کا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے۔ پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ ہیجانی کیفیت میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا

محسوس کرنے لگا۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اس نے پنچایت کے فیصلہ کو قبول کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کرلیا اور پھر کھڑا ہوکر اپنے پوتوں سے کہنے لگا۔

"سنو ___ یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دوری پر ہے۔ میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لیے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا ___ اگلے برس جب ہل چلیں گے ___ بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت سے کونپلوں کو جنم دے گا ___ تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کردینا۔ بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمھاری فصلوں کی حفاظت کروں گا، جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا۔ اور تمھارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہوجائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں ___ وہیں رہنے دینا ___ تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انھیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا ___ کہ بجوکا بےجان نہیں ہوتا ___ آپ سے آپ اسے زندگی مل جاتی ہے اور اس کا وجود اسے درانتی تھما دیتا ہے۔ اور اس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہو جاتا ہے"

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اس کے پوتے اور پوتیاں اس کے پیچھے تھے۔ اور پھر اس کی بہوئیں۔ اور ان کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہوگیا۔ اس کے پوتے پوتیوں نے اسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا ___ اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے ___ بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اتار کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اپنا سر جھکا دیا۔

سلام بن رزاق

کالے ناگ کے پُجاری

شہر کے سارے پھاٹک بند ہو چکے تھے اور فصیلوں پر سیاہ پوش سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ ان کے لمبے لمبے نیزوں کی انیاں آسمان کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ بعض سپاہی اپنے اپنے چلّوں پر تیر چڑھائے چوکس نگاہوں سے گرد و پوش کا جائزہ لے رہے تھے۔ اگر انھیں ایک متنفس بھی فصیل کی طرف یا دروازے کی سمت بھاگتا دکھائی دیتا تو فوراً دو چار تیر ایک تیز سنسناہٹ کے ساتھ چلّوں سے نکلتے اور مفرور شخص کے جسم میں پیوست ہو جاتے۔ اگر کوئی شخص سخت جان ان تیروں کی زد سے بچ جاتا تو شہر کے پھاٹکوں پر کھڑے سپاہی اپنے بڑے بڑے جال اُس پر پھینکتے اور اُسے فوراً گرفتار کر کے ایک مخصوص قسم کے بورے میں بند کر دیتے اور وہ سر بمہر بورا کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ شہر کی سڑکیں صبح سے شام تک سیاہ پوش سپاہیوں کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ سے گونجتی رہتیں اور عجیب پُراسرار قسم کی پھنکاریں فضا میں سرسراتی رہتیں جیسے ہوائیں کسی اندرونی کرب سے سسکیاں بھرتی گزر رہی ہوں۔ ایک

عجیب ماتمی کیفیت شہر کے طول و عرض پر مسلط تھی۔ فرار کے سارے راستے مسدود تھے۔

داستان گو بوڑھا ایک لمحے کو رکا۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ڈبے میں صرف چھ سات مسافر باقی رہ گئے تھے اور بوڑھا داستان گو اپنے پر اسرار وجود کی بنا پر اساطیری کہانیوں کا کردار لگ رہا تھا۔ مسافروں کی خوف اور حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں بوڑھے کے جھریوں دار چہرے گڑی تھیں۔ بوڑھا چند لمحوں تک اسی طرح خاموشی سے کھڑکی کے باہر اندھیرے میں گھورتا رہا۔ پھر کھنکھار کر بولا۔

شہر میں صرف دو قسم کے لوگ رہتے تھے۔ ایک وہ جو کالے ناگ کے پجاری تھے اور دوسرے وہ جو صرف کالے ناگ کے لیے چارے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ کالے ناگ کے پجاری مضبوط آہنی دیواروں کے پیچھے بڑی محفوظ اور پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ جب کہ باہر لوگوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔

سڑکیں، فٹ پاتھ اور گلیاں ہر جگہ سڑے گلے انسانی جسموں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے جو محض اس لیے زندہ معلوم ہوتے تھے کہ ابھی ان کی سانسیں چل رہی تھیں۔ لوگ ہر وقت جنازے اور ارتھیاں اٹھائے جلوس کی شکل میں سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے نظر آتے۔ جھکی ہوئی گردنیں اور لٹکے ہوئے چہرے لیے لوگ دھیرے دھیرے اس طرح قدم اُٹھاتے جیسے اُنھیں موت کی سزا سنا دی گئی ہو۔ یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا۔ شہر کی ساری سڑکیں قبرستانوں اور شمشان گھاٹوں کے دروازوں پر جاکر ختم ہو جاتی تھیں۔ جن کے پھاٹکوں پر جلی حروف میں "خوش آمدید" لکھا ہوتا تھا۔ بازاروں اور دکانوں میں کٹے پھٹے انسانی اعضا سجائے جاتے تھے۔ قہوہ خانوں میں خون سے لبریز پیالیاں کھنکتی رہتیں۔ دوائی اور انجکشنوں کی ہر شیشی پر سرخ حروف

میں لکھا ہوتا "موت"۔

سب کچھ اس طرح اُلٹ پلٹ گیا تھا کہ لوگ ہمیشہ یہ محسوس کرتے رہتے جیسے وہ سڑکوں پر سر کے بل چل رہے ہوں۔ لوگ جب زندگی کے عذاب کو جھیلتے جھیلتے تھک جاتے تو سکون کی خاطر ایسی عبادت گاہوں میں پناہ لیتے جہاں سارے اصول کھنڈر بن چکے تھے اور محرابوں پر مکڑیوں نے جالے تان دیے تھے۔ قریب قریب سبھی انسانوں کے مُنہ پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اگر دو چار لوگ کوشش کر کے آپس میں بولتے بھی تو ان کی گفتگو کچھ اس قسم کی ہوتی۔

لفظوں کے ملبے میں معنی تلاش فضول ہے۔

بے معنویت کا زہر زندگی کی رگ رگ میں پھیل چکا ہے۔

ساری قدریں سر کے بل کھڑی ہیں۔

انسان نے ہمیشہ نفرت بوئی ہے، نفرت ہی کاٹے گا۔ وغیرہ"

داستان گو بوڑھا ایک بہ یک خاموش ہو گیا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ اپنی ہی خاموشی کے بوجھ تلے دبے، بوڑھے کی طرف متجسسانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب تھوڑی دیر تک بوڑھا کچھ نہ بولا تو ایک شخص نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

"بابا! کیا یہ سب آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

بوڑھے نے دھیرے دھیرے گردن اٹھائی۔ چند لمحوں تک اُس شخص کو خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا پھر بولا —— "ہاں میں نے سب کچھ اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔"

بوڑھا کھڑکی سے باہر اندھیرے میں نظریں گڑائے اپنے آپ میں بڑبڑا رہا تھا۔

"آج بھی وہ سارے مناظر میری نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ٹرین کی پٹری پر یہاں سے وہاں تک بے شمار انسانوں کو لٹا دیا گیا ہے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ آنکھوں پر پٹیاں کسی ہوئی ہیں۔ اتنے میں سیاہ رنگ کی ایک ٹرین جس کے انجن پر کالے رنگ کی تصویر بنی ہے، دندناتی ہوئی آتی ہے اور انسانی جسموں پر سے اس طرح گزر جاتی ہے کہ تمام انسان دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پھر یہ ہوتا ہے کہ ان کے کٹے پھٹے اعضا سے خون کے فوارے پھوٹ پڑتے ہیں اور خون کے ایک ایک قطرے سے ایک نیا آدمی جنم لیتا ہے۔ انتہائی لاغر اور مرا مرا سا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف سے دیو پیکر ٹرک گھڑگھڑاتے آدھمکتے ہیں۔ جن میں ویسے ہی سیاہ پوش سپاہی تیر کمان اور تھیلے لیے بیٹھے ہیں جیسے قلعہ کی فصیل پر پہرہ دینے والے تھے۔ پھر وہ لوگ ٹرک میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک عجیب و غریب چھڑی نکالتے ہیں جو مچھلی پکڑنے کی بنسی سے ملتی جلتی ہے۔ اُس کے ایک سرے پر ایک دھاگا لٹک رہا ہے، جس میں ایک پُرزہ پھنسا ہوا ہے۔ پرزے پر لکھا ہے "ضرورت ہے"۔ پُرزے کی تحریر اندھیرے میں روشنی کی طرح چمکتی ہے۔ لوگ اُس تحریر کو پڑھتے ہی پرزے کی طرف لپکتے ہیں اور جو بھی اُس پُرزے کو چھوتا ہے اُسی سے چپک جاتا ہے۔ پھر سیاہ پوش سپاہی انھیں پکڑ کر اپنے مخصوص قسم کے تھیلوں میں بند کر دیتے ہیں اور تھیلا ٹرک میں ایک طرف کو لڑھکا دیتے ہیں۔ جب ٹرک بھر جاتا ہے تو ڈرائیور اُسے ایک دم سے اسٹارٹ کر کے لوگوں کی بھیڑ کو روندتا کچلتا آگے بڑھ جاتا ہے۔ کرب ناک چیخوں سے چاروں دشائیں کانپنے لگتی ہیں۔"

بوڑھا یکبارگی چُپ ہو گیا۔ پر لوگوں سے زیادہ دیر تک چُپ نہیں رہا گیا۔

ایک شخص نے بے حد مضطربانہ انداز میں پوچھا

"وہ ٹرک کس کے ہوتے تھے؟"

بوڑھے کی سفید گھنی پلکیں آہستہ آہستہ اوپر کو اُٹھیں اور اُس کے ہونٹ ہلے

"اُن ٹرکوں پر انسانی کھوپڑی کا نشان بنا ہوتا تھا اور کھوپڑی کے اوپر کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا رہتا۔"

"ان مریل آدمیوں کو کہاں لے جایا جاتا تھا؟"

"انھیں آہنی دیواروں کے اُس پار لے جایا جاتا جہاں کالے ناگ کے پجاریوں کا مسکن تھا۔ کالے ناگ کے پُجاری مہر بند تھیلیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے، اور ٹرک والوں کو ان کی خدمات کے عوض قیمتی تحائف پیش کرتے۔ تحائف لے کر ٹرک والے تو لوٹ جاتے، پھر کالے ناگ کے پجاریوں کے اشارے پر مہر بند تھیلے کھولے جاتے جن میں سے وہی مریل آدمی برآمد ہوتے۔ جنھیں دیکھ کر کالے ناگ کے پجاری کافی محظوظ ہوتے۔ پھر ان کے اشاروں پر ایک ایک آدمی کو سامنے ایک بڑے سے پنجرے میں ڈھکیل دیا جاتا۔ جس میں ایک قوی الجثّہ کالا ناگ پھنکارتا رہتا۔ جوں ہی مریل آدمی کو پنجرے میں پھینکا جاتا۔ کالا ناگ اُس آدمی پر ٹوٹ پڑتا۔ اور دل دوز چیخوں سے فضا تھرّانے لگتی۔ اور کالے ناگ کے پُجاری اپنی موٹی توندوں پر ہاتھ پھیرتے بڑے پُرسکون انداز میں گردنیں ہلاتے رہتے۔ گویا جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی توقع کے عین مطابق تھا۔

کالے ناگ کی پھنکاریں تیز سے تیز تر ہوتی جاتیں اور وہ اچھل اچھل کر اُس مریل آدمی کی طرف لپکتا اور اپنی تیز زہریلی زبان سے اُس کے جسم کے کسی نہ کسی حصّے

چاٹ کر پلٹ جاتا۔ رفتہ رفتہ مریل آدمی کی چیخیں مدھم پڑتی جاتیں۔ اُس کا مچلنا تڑپنا بھی بند ہو جاتا اور اُس کے ہونٹوں سے صرف کراہیں نکلتی رہتیں۔ کالا ناگ اُس کے جسم سے برابر خون چوسے جاتا۔ پھر اُس کی رفتار بھی سست پڑ جاتی۔ غالباً اس کا پیٹ بھر چکا ہوتا —— پھر یوں ہوتا کہ کالا ناگ کنڈلی مار کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ اُس کی آنکھیں شکم سیری کے خمار سے مُند جاتیں۔ دوسری طرف اُس کا شکار اب صرف گہری گہری سانسیں لیتا رہتا۔ پھر کالے ناگ کے پجاری اپنے غلاموں کو اشارہ کرتے۔ غلام مریل آدمی کے نیم مردہ جسم کو گھسیٹ کر پنجرے کے باہر نکالتے اور سڑک پر پھینک آتے، جہاں وہ اپنے ہی جیسے ہزاروں لوگوں کی بھیڑ میں شامل ہو جاتا۔

اس کھیل کے بعد کالے ناگ کے پجاریوں کے چربیلے چہرے اذیت کوشی کی مسرت سے تمتمانے لگتے۔ اُن کی آنکھیں اُس شریر بچّے کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگتیں جس نے ابھی ابھی اپنی غلیل سے کسی ننھّی سی فاختہ کو نشانہ بنایا ہو۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا پھر خاموش ہو گیا۔ اُس کا چہرہ کسی پتّھر کی سل کی طرح سخت اور سپاٹ تھا۔ ڈبّے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھوں کا خوف کچھ اور گہرا ہو گیا۔ ایک شخص نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بابا! کیا اُس شہر میں کوئی قانون نہیں تھا؟"

"قانون!" بوڑھا دھیرے سے بولا۔ "قانون ہمیشہ زبردست کی لاٹھی کی طرح ہوتا ہے جس سے طاقت ور اپنے سے کم زور لوگوں کو بھیڑ بکری کی طرح ہانکتا رہتا ہے۔ اُس شہر میں بھی صرف کالے ناگ کے پجاریوں کا قانون چلتا تھا۔ جس کی حفاظت

سیاہ پوش سپاہی کرتے تھے۔"

"تو کیا وہ کروڑوں لوگ، سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر اسی طرح سسک سسک کر مرتے رہے؟"

"ہاں ___ موت اُن کا مقدر بن چکی تھی اور زندگی اُن کے لیے عذاب سے کم نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ مریل اور لاغر ہڈیوں کے ڈھانچے غول در غول کالے ناگ کے پجاریوں کے مسکن پر دھاوا بول دیتے تھے۔ مگر آہنی دیواروں کے گرد تعینات سیاہ پوش محافظ انھیں نیزوں اور برچھیوں پر رکھ لیتے اور خندقوں کو لاشوں سے پاٹ دیتے۔ پھر ایک عرصے تک کوئی اُن آہنی دیواروں کا رُخ نہ کرتا۔"

بوڑھے نے خاموش ہو کر اپنے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر ڈالی۔ نیم اُجالے، نیم اندھیرے میں سبھوں کے چہرے خوف و دہشت سے زرد پڑ گئے تھے۔ بوڑھا تھوڑی دیر تک غور سے ایک ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر دھیرے سے بولا۔

"مگر کالے ناگ کے پجاریوں کا کاروبار زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا اور ایک دن وہ خود بھی کالے ناگ کا شکار ہو گئے۔"

"کیا ___!" ڈبے میں بیٹھے تقریباً سبھی لوگ مسرت سے چیخ پڑے۔" کالے ناگ کے پجاری مارے گئے؟"

"ہاں ___" بوڑھے داستان گو کی پُراسرار بھاری آواز کسی اندھے کنوئیں کی بازگشت کی طرح سنائی دی۔" کالا ناگ شہر کے سارے لوگوں کا خون پی چکا تھا اور اس کی پیاس روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ ایک دن سیاہ پوش سپاہی کالے ناگ کے لیے تازہ دم شکار مہیا نہ کر سکے۔ تب کالے ناگ نے اپنی شیطانی پیاس سے پریشان ہو کر

اپنے پجاریوں پر حملہ کر دیا اور اپنے زہریلے دانت ان کی گردنوں میں گاڑ دیے۔ پجاری ہاتھ پیر پٹکتے رہے اور کالا ناگ ان کا خون پیتا رہا۔ پھر ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ پجاریوں کی موت کے بعد کالا ناگ بھی آہنی دیواروں سے اپنا سر ٹپک ٹپک کر ختم ہو گیا۔ اس طرح اُس شہر کے کروڑوں لوگوں کو اس بھیانک کھیل سے نجات مل گئی۔"

بوڑھا اتنا کہہ پایا تھا کہ ٹرین کی تیز وسل سنائی دی اور سنّاٹے کا کلیجا دُور تک چھدتا چلا گیا۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رک رہی تھی۔ بوڑھا چونک کر کھڑا ہو گیا۔ "اوہو! مجھے اسی اسٹیشن پر اُترنا ہے۔" اُس نے جلدی سے اپنا میلا جھولا بغل میں دبایا اور ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے رخصت ہو کر پلیٹ فارم پر اُتر گیا۔ مسافروں کے چہروں پر دوبارہ مسرت اور اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ وہ لوگ بوڑھے کی داستان پر آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگے۔

میں چپکے سے اٹھا اور اُس بوڑھے کے پیچھے ہی گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ باہر چاروں طرف سنّاٹا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت اور پلیٹ فارم، یہاں سے وہاں تک اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بوڑھا سر جھکائے ایک طرف کو چلا جا رہا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے بوڑھے کو آواز دی۔ "بابا!"

بوڑھا ٹھٹکا، ٹھٹک کر مڑا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اُس کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ پھر اُس کی چبھتی نگاہوں سے بچنے کے لیے اُس کے میلے جھولے پر نظریں گڑائے پوچھا۔ "دراصل بات یہ ہے بابا! کیا کالے ناگ کے پجاری سچ مچ مارے گئے؟"

بوڑھے نے چونک کر گردن اٹھائی۔ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا۔ پھر

تھوڑے سے توقف کے بعد دھیرے سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"مجھے آپ کے آخری بیان پر شبہہ ہے!"

اچانک بوڑھے کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے بے پناہ کرب جھلکنے لگا۔

اُس نے انتہائی مایوس کن لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارا شبہہ درست ہے۔ میں نے محض ڈبے میں بیٹھے لوگوں کا خوف دور کرنے کی غرض سے جھوٹ بولا تھا۔ ورنہ حقیقتاً کالے ناگ کے پجاری آج بھی زندہ ہیں اور اُن کا وہ خونی کاروبار اسی طرح جاری ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ بوڑھا مڑا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ایک طرف کو چلنے لگا۔ میں اندھیرے میں مدغم ہوتی اُس کی پُراسرار شبیہہ کو گھورتا رہا۔

میں نے غور کیا۔ فضاؤں میں پُراسرار قسم کی پھنکاریں اب بھی سرسرا رہی تھیں۔

انور خان

بھیڑیں

نوجوان پادری نے بس کی قطار میں کھڑے بھٹکی ہوئی بھیڑوں کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا کہ روزانہ وہ نامعلوم کتنے لوگوں کو راہ راست پر لاتا رہتا ہے۔ لیکن ان کی تعداد کبھی کم ہی نہیں ہوئی۔ پھر اسے بائبل کی تعلیم یاد آئی۔ "کل کے لیے فکر نہ کرو کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا۔ آج کے لیے آج کا دن کافی ہے۔" وقت تھوڑا ہے اور کام بہت۔ اس نے سوچا۔ اسے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کیوں نہ وہ واپس لوٹ جائے۔ پارٹی میں خواہ مخواہ وقت خراب ہوگا۔ لیکن پتہ نہیں کون کب راہِ راست پر آئے۔ اسے ہر ایسی جگہ جانا چاہیے جہاں بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھے راستے پر لایا جاسکتا ہو۔ اسے ایک لمحہ بھی برباد نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے قریب کھڑے آدمی کو جو اخبار پڑھ رہا تھا۔ دیکھا اس کے ساتھ کیسے بات چیت کا آغاز کرے۔ آخر کچھ کر اس نے اس سے پوچھا۔

(کیا آپ کے پاس روح ہے؟) Do you have Soul?

"جی نہیں" اس شخص نے لاپرواہی سے کہا "شاید اس کے پاس ہو۔"
اپنے پاس والے آدمی کی طرف اشارہ کر کے وہ آدمی پھر اخبار پڑھنے لگا۔
"کیا چاہیے آپ کو؟" جس آدمی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اُس نے پوچھا۔
"کیا آپ کے پاس روح ہے؟" پادری نے انتہائی ملائمیت سے سوال کیا۔
"کبھی نہیں سُنا، یہ کیا چیز ہوتی ہے؟" اُس آدمی نے پوچھا۔
"دیکھیے ابھی آپ زندہ ہیں"...... پادری نے خوش مزاجی دکھاتے ہوئے
کہا کہ اسے گفتگو جاری رکھنے کا موقع مل گیا تھا۔
"دیکھیے جناب دن بھر دفتر کا کام کرنے کے بعد میں اس موڈ میں نہیں ہوں
کہ کوئی لمبی تقریر سُنوں۔ آپ جانتے ہوں تو بتائیے یا بات ختم کیجیے" اُس
آدمی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
"یہی تو مشکل ہے۔ آپ کو پتہ نہیں۔ لوگ دُنیاوی کاموں میں ایسے اُلجھے
ہیں کہ جانتے نہیں کہ خدا کی حکومت...... پادری بیچارگی سے کہنے لگا۔
"دیکھیے جناب، مجھے پریشان مت کیجیے" اُس شخص نے جھلا کر پھر بات
کاٹ دی۔ پادری نے داہنے ہاتھ سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور خاموشی
سے کھڑا ہو گیا۔ ایس آئی۔ وہ سوار ہوا۔ اُس کا موڈ خراب ہو گیا تھا لیکن فرض
بہ ہر حال فرض ہے۔ پاس بیٹھے طالب علم سے اُس نے پوچھا۔
"بچے تمھارے پاس رُوح ہے؟"
"میری اُمی مجھے ایک رُوپے سے زیادہ نہیں دیتیں"۔ اُس بچے نے جواب دیا۔

"ستر پیسے کی آئس کریم آجاتی ہے۔ تینتیس[۳] پیسے بس کے کرائے کے ہوتے ہیں اور دوسری کوئی چیز میں نہیں کھاتا۔"

"نہیں رُوح کھانے کی چیز نہیں، وہ ......" پادری انتہائی صبر سے اُسے سمجھانے جارہا تھا کہ بچّے نے بات کاٹ دی۔

"تب جانے دیجیے جناب! آپ یہ الجبرا کا سوال حل کر سکیں گے"؟ طالب علم نے پوچھا۔

"جی نہیں، مجھے الجبرا نہیں آتا۔" پادری نے جواب دیا۔

"آپ نے اسکول کا امتحان پاس نہیں کیا؟" طالب علم نے حیرت سے پوچھا۔ "صورت سے تو آپ پڑھے لکھے نظر آتے ہیں۔"

"میں۔میں ....." پادری کو پسینہ آگیا۔

طالب علم لاپرواہی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

پادری پارٹی میں پہنچا۔ ایک دو پیگ کے بعد طبیعت کچھ بحال ہوئی ۔ وہ خندہ پیشانی سے لوگوں کے ساتھ بات چیت میں مصروف ہو گیا لیکن سوال اس کے دماغ سے چپک کر رہ گیا تھا۔

"کیا آپ کے پاس رُوح ہے؟ پاس کھڑی خاتون سے بات کرتے کرتے یکایک وہ پوچھ بیٹھا۔

"جی نہیں، میں اِن فرسودہ باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔" خاتون نے جواب دیا اور اپنے قریب کھڑے لوگوں سے تمسخر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"کیوں جناب، آپ لوگوں میں کسی کے پاس روح ہے۔؟"

پھر تو فضا میں مستقل قہقہے برسنے لگے۔ ہر آدمی ایک دوسرے سے پوچھتا۔
"کیوں صاحب آپ کے پاس روح ہے؟" اور ہنس پڑتا۔
پادری ہکا بکا ایک ایک کو دیکھ رہا تھا۔ سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔
"ہم تو تمھیں ایک خوش مذاق آدمی سمجھ رہے تھے۔ یہ آج تم نے کیا پٹا پٹایا
سوال چھیڑ دیا۔" ایک شخص نے پادری سے کہا۔
اس سے قبل کہ پادری کچھ کہتا، کسی اور نے چھیڑا۔

" Reoly Father you are The

soul of to day's Party"

"فادر کیا تمھارے پاس روح ہے؟" ایک نوخیز لڑکی نے چھیڑا۔"
پھر قہقہے اُڑے۔
"ہاں، میرے پاس روح ہے۔" پادری نے خود اعتمادی سے کہا۔
"تو دکھاؤ!" کئی آوازیں آئیں۔
"روح دکھائی نہیں جا سکتی۔" اُس نے کہا۔
"پھر تم بکواس کر رہے ہو۔" کئی ایک چلائے۔
"آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔" پادری نے جوش سے کہا۔
"ہم سُنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔ اگر تم کہتے ہو کہ کسی چیز کا وجود
ہے تو تمھیں دکھانا ہوگا۔"
نوجوان پادری جھنجلا کر باہر آ گیا۔ بس پکڑ کر وہ چرچ واپس آیا اور مسیح
کے مجسمے کے سامنے جھکنے لگا۔ لیکن وہ مجسمہ گھورتا رہ گیا۔ سفید مرمریں پتھر سے بنا

مسیح اُسے بے جان لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ریونڈ فادر ڈائس کے پاس آیا۔

"آؤ آؤ، کیا بات ہے، تمھاری طبیعت کچھ ناساز معلوم ہوتی ہے"۔ ریونڈر فادر ڈائس نے کہا۔

"فادر، کیا آپ کے پاس رُوح ہے"؟ نوجوان پادری نے پوچھا۔

"ریونڈر فادر اُسے دیکھتا رہ گیا۔ پھر آگے بڑھ کر اُس نے اُس کے کندھے تھپتھپائے اور کہا۔" بچے تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم بہت زیادہ کام کرنے لگے ہو۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ دو تین دن مکمل آرام کرو۔"

وہ اپنے کمرے میں بستر پر گر گیا۔ رات دیر تک اُسے نیند نہیں آئی۔ دوسرا روز گزرا، تیسرا روز گزرا، کئی دن گزر گئے۔ ہر شخص اپنے کام میں، اپنی فکروں میں مگن تھا۔ بھیڑوں کی تعداد ہمیشہ جتنی ہی تھی ـــــ وہ سوچنے لگا۔ کیا یہ سب غلط ہیں اور میں صحیح ہوں۔ ہوسکتا ہے یہی لوگ صحیح ہوں۔ کیا یہ دُرست ہے کہ قیاس کو ثبوت نہیں مانا جاسکتا۔؟

اُس شام پادری باہر نکلا تو سوچ سوچ کر نڈھال ہو چکا تھا۔ راستے پر کچھ بچے دوڑ لگا رہے تھے۔ کچھ نوجوان قریب کے میدان میں کھیل رہے تھے۔ بہت سے لوگ خوشی خوشی گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ یہ سب لوگ غلط نہیں ہوسکتے۔ اُس نے سوچا۔ میں دُنیا کو ٹھیک کرنے نکلا ہوں جب کہ شاید مجھے خود کو ٹھیک کرنا چاہیے۔ غالباً روح کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سوچ کر اُس کا دماغ ہلکا ہو گیا۔ وہ بے ساختہ زور سے ہنس پڑا۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔

اُس نے خود سے کہا۔ اپنے جسم کو میں نے کتنی اذیت پہنچائی ہے۔ کتنی خوبصورت زندگی ہے یہ۔ یہاں ہر چیز درست ہے۔ مسرت کی لہر اُس کے بدن میں دوڑ گئی۔ مجھے گذرے ہوئے دنوں کی تلافی کرنی چاہیے۔ اُس نے سوچا اور نکڑ کے شراب خانے میں چلا گیا۔ کوئی میز خالی نہیں تھی۔ ایک میز پر ایک کرسی خالی نہیں تھی۔ ایک میز پر ایک کرسی خالی دیکھ کر وہ اُس کی طرف بڑھ گیا۔ ایک مزدور اُس کے پاس بیٹھا تھا۔ دو تین پیگ چڑھانے کے بعد اس کی طبیعت کسی سے بات کرنے کو چاہی۔

"کیا تمھارے پاس روح ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"ہاں!" اُس آدمی نے جواب دیا۔ وہ بُری طرح پئے ہوئے تھا۔

"کیا؟" پادری چونک پڑا۔ "تمھارے پاس روح ہے؟"

"ہاں!" اُس آدمی نے سکون سے اپنا جواب دُہرایا۔

"تو دکھاؤ۔" نوجوان پادری نے کہا۔

اُس مزدور نے ایک نظر پادری کو دیکھا اور پوچھا۔

"کیا تمھارے پاس روح ہے؟"

"نہیں!" نوجوان پادری نے نشے سے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو تم دیکھ نہیں سکتے۔" مزدور نے کہا۔ تم تباہ ہو چکے ہو، تم جہنمی ہو۔ تم برباد ہو گئے ہو۔" وہ چیخا۔

پادری کا نشے میں ڈولتا بدن لرز گیا۔ وہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ "میں بھی برباد ہو چکا ہوں۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں تباہ ہو چکا ہوں، میں جہنمی

ہوں۔" وہ میز پر سر رکھ کر رونے لگا۔

شراب خانے میں کھلبلی مچ گئی۔ "یہ کون ماحول درہم برہم کر رہا ہے؟"

شراب خانے کے مالک نے اُس پیے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"یہ آدمی تباہ ہو چکا ہے۔" اُس مزدور نے کہا۔ "کہتا ہے اُس کے پاس

رُوح نہیں آج کل پادریوں کا یہ حال ہے۔"

سب نے مل کر پادری کو اٹھایا اور شراب خانے کے باہر ڈال دیا۔ اور

افسوس کرتے ہوئے دوبارہ شراب خانے میں چلے گئے۔

نوجوان پادری فٹ پاتھ پر بیٹھا روتا رہا۔ "میں تباہ ہو گیا۔ میں برباد

ہو گیا۔"

شوکت حیات

گرم تپتی ہوئی سڑک سنسان .....

سنیچر کو آدھے دن کی اسکول سے چھٹی پائے ہوئے لڑکوں کے جھنڈ اب یہاں وہاں مکانوں میں گم ہو چکے تھے ....

اور اکا دکا وہی ..... بس وہی لڑکے رہ گئے جن کے گھر یا تو دور تھے....

یا جن کے ہاتھوں میں گولی، غلیل یا گلی ڈنڈا......

سڑک سنسان تھی......

گرم ہوائیں حرارت کی انتہا پر تھیں......

اور لو کے خوف سے لوگ دفتروں، کارخانوں اور گھروں میں بند تھے...

.... سڑک پر کوئی نہیں تھا..... سوا اس آدمی کے..... اور اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر دو لڑکوں کے جو اسکول سے آوارہ گردی کرتے ہوئے گھروں کی طرف جا رہے تھے......

وہ آدمی سڑک پر چلتے چلتے پیچھے مڑا اور دو لڑکوں کو ایک ساتھ، کچھ نپے تلے، کچھ بہکے بہکے قدموں کے ساتھ چلتے دیکھ کر شک و شبہات میں گم ہوا...

— یہ لڑکے مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں......!

— یہ لڑکے مجھے ہی کیوں دیکھ رہے ہیں......؟

— چلتے ہوئے آگے دیکھنا ہوتا ہے ...... لیکن آگے صرف میں ہی تو نہیں ہوں.......!؟

— یہ لڑکے مجھے ......؟؟؟

اس آدمی نے آسمان کی طرف آنکھیں اٹھائیں۔

جہاں سورج اپنی گرمی سے پگھل رہا تھا......

ہوائیں اب سفر ختم کیا چاہتی تھیں ......

اس نے مڑ کر پھر دیکھا ——

دونوں لڑکوں میں سے ایک نے بھاری بھر کم کتابوں کے تھیلے میں ہاتھ ڈالا..... دوسرے لڑکے کی آنکھیں اس کی انگلیوں کا تعاقب کرتی ہوئی تھیلے میں داخل ہوئیں۔

— یہ لڑکے —— آخر وہی ہوا نا......!

— یہ لوگ تھیلے میں سے بم نکالیں گے اور مجھے ڈھیر کر دیں گے...!

— لیکن میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے......؟

— میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے.....!

وہ آدمی ہی تھا جس نے سنسناتی ہوئی لہروں کے بیچ " دھماکہ....

دھماکہ......" بڑبڑاتے ہوئے پھر آسمان کی جانب تاکا۔۔۔۔۔

جہاں پگھلتے ہوئے سورج کے آگے پیچھے دو گروہوں میں چیخوں کا ہجوم تھا...

دونوں گروہ ایک دوسرے گروہ پر آتشیں ذرّات اُچھال رہے تھے اور

دھماکوں کے ساتھ چیخیں ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھیں۔

اس نے آسمان میں دیکھا۔۔۔۔۔

چیخوں کے ایک گروہ میں دونوں لڑکے تھے جو آتشیں گولے کے ساتھ اس کا

تعاقب کر رہے تھے۔

۔۔۔۔۔ وہ دوسرے گروہ میں تو نہیں تھا......!

۔۔۔۔۔ پھر یہ لڑکے اس کی جان کو کیوں آگئے تھے......؟

اس نے مڑ کر پھر دیکھا۔۔۔۔۔

وہ ہاتھ جو تھیلے میں گیا تھا اب باہر آچکا تھا...... آنکھیں جو تھیلے میں

داخل ہوئی تھیں اب کھلی ہوا میں سانسیں لے رہی تھیں دم لینے کے بعد متعاقب

آنکھوں والے لڑکے نے تھیلے سے باہر نکلے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اپنی آنکھوں

اور اپنے سرکتے ہوئے قدموں کو متصل کرتے ہوئے "اسٹارٹ" کا نعرہ بلند کیا...

...... دوسرے لڑکے نے اپنا تھیلا اُس کے ہاتھوں میں تھما دیا......

وہ جو آدمی ہی تھا خوف سے لرزتا ہوا دائیں بائیں آگے پیچھے کسی پناہ گاہ

کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا گھٹی گھٹی آوازوں میں " دھماکہ...

دھماکہ......" بڑبڑانے لگا...... اس کے کانپتے ہوئے قدموں میں تیزی آگئی...

لیکن سامنے لمبی اور اتھاہ تپتی ہوئی چٹیل تارکول کی سڑک تھی ......

کوئی گلی بھی نہیں تھی ...... مکانوں، کارخانوں اور دفتروں کے دروازے بند تھے ...... اور سناٹے اپنی جھلسا دینے والی لہروں کے ساتھ قلقاریاں مار رہے تھے ......

اور ان ساعتوں کے بیچ کہیں کوئی راہ نہ پاکر مرنے سے پہلے اس نے خود کو سڑک کے اندر ہی دفن کرنا چاہا لیکن کہیں کوئی تیشہ نہیں تھا سوا اس کی چپلوں کی سوکھی ہوئی نوکیلی زبان کے ..... جو خود اسے ہی کھودتی جاتی تھی۔

افراتفری کے عالم میں اپنی کانپتی ہوئی آنکھوں کو کسی طرح قابو میں کرتے ہوئے وہ پھر پیچھے مڑا ——

پہلے لڑکے کا داہنا ہاتھ اب اوپر اُٹھنے والا تھا..... دوسرے لڑکے کی آنکھیں اب بھی اس کی مٹھیوں سے متصل تھیں......

پل دو پل کی دیر میں دھماکہ ہونے والا تھا اور وہ ......

وہ جو آدمی ہی تھا پسینے میں شرابور ہوا اور ہانپ ہانپ کرتے ہوئے خوف کی سنسناتی خلاؤں میں اس نے ادھر اُدھر ناامیدی سے آنکھیں گھمائیں تو پیروں کی رفتار میں مزید تیزی آگئی ......

اس نے آسمان کی اور تاکا ——

چیخوں کے گروہ ایک دوسرے پر حملہ آور تھے .....

زمین بے وزنی کے عالم میں ہانپ رہی تھی ......

ہواؤں کے آخری چند ریزے کہیں منھ چھپانے کی جگہ تلاش کرنے میں پاگل تھے۔

آخری چیخوں کے اوپر صور پھونکا جا رہا تھا......

وہ جو آدمی ہی تھا...... کپکپاتا ہوا پیچھے مڑا ——

لڑکوں اور آدمی کے بیچ کا فاصلہ بڑھ کر کم ہو چکا تھا ——

اس نے قدم مزید تیز کیے...... لڑکے نے بھی قدموں کو تیز کر دیا......

اس نے دوڑنا شروع کیا...... لڑکا بھی دوڑنے لگا......

اس نے تیز دوڑنا شروع کیا...... لڑکا بھی تیز ہو گیا......

—— بس...... میں چند ساعتوں کا مہمان ہوں......

لڑکے ہاتھ اب تیزی کے ساتھ نیچے آیا ہی چاہتا تھا کہ آدمی نے قدموں کو پاگل بنایا...... اور مسلسل دوڑتا گیا......

آخری لمحوں میں آسمان پر متصادم چیخ و پکار کے بیچ متزلزل صور کی آواز سننے کے بعد......

حصہ دار چہروں کی بھیڑ میں اس نے اپنے آپ کو لڑھکا دیا...... اور پھر خون میں لت پت جسم و جان کے ساتھ سبھوں سے اپنی کوتاہیوں کے لیے فریاد رہی ہو!......

وحشت اس کے چہرے پر قہقہہ بردار رقص کر رہی تھی......

حصہ دار چہروں کی آنکھوں میں خوف و رحم کی ندی تھی......

تپتی ہوئی سڑک پر آنے سے پہلے حصّہ دار چہروں نے مسلسل کئی دنوں کے کرفیو کی قید سے چھوٹے ہوئے شہر میں بم کے متعدد حادثوں کی دہائی دیتے ہوئے دوپہر کے سنّاٹے میں اُسے باہر نکلنے سے روکنا چاہا تھا لیکن وہ حوصلوں کا ذخیرہ اکٹھا کرتا ہوا باہر نکل آیا...... اپنی اور حصہ دار چہروں کی سانسوں کی بقا کے لیے تپتی ہوئی سڑک پر نکل کر

جد و جہد کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ضروری تھا...... اور اب سڑک پر دوڑتے ہوئے وہ مفلس ہوا ...... وحشت زدہ رقص کے درمیان اپنے ذخیروں کی ناکام فراہمی پر "دھماکہ ......" کی صدائیں لگاتا ہوا وہ شرمندہ ہوا اور مجبوریوں کی چنگاریاں محسوس کرتے ہی سبھوں سے معافی کا غلام بنا......

— مجھے معاف کرنا ...... معاف کرنا ......!

— تم لوگوں کا کہنا نہیں مانا...... اور اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہوں!

— تم لوگ ٹھیک کہتے تھے ...... وقت خراب ہے ...... اور یوں سناٹے میں سڑک پر نکلنا......"

— لیکن تم لوگوں کی سانسوں کی بقا...... یوں بھی میں کون سا زندہ تھا ......لیکن یہ مفت کی موت ...... یوں اچانک ......خس کی ٹٹی سے چھنتی خوشبودار ہوا کھانے والوں کو مارے بغیر جن کے سبب بھری دوپہر میں مجھے اپنے پیروں کو سڑک کی بھٹی میں جھونکنا پڑا ہے ......!!

مسلسل دوڑتے ہوئے آخری بار سہمی سہمی نگاہوں سے پیچھے کی جانب دیکھتے ہی وہ دھماکہ ...... دھماکہ ...... بچاؤ ...... بچاؤ......" چیخنے لگا ...... لیکن اس کی آوازوں کی مچھلیاں خشک گلے میں تڑپ کر رہ گئیں۔

فاصلہ جو بڑھنا تھا اور بھی کم ہوا ......

لڑکا مسلسل دوڑتا رہا......

ہاتھ جھٹکے کے ساتھ نیچے آیا ہی چاہتا تھا......

مٹھیاں اب کھلنے ہی والی تھیں ......

___ اب میں نہیں بچوں گا ......!

___ اگلے ہی پل لڑکے کا ہاتھ چل جائے گا اور ...... میں مفت میں راکھ کا ڈھیر بن جاؤں گا۔

لڑکے کے مٹھی کا نشانہ اسی کی طرف تھا۔ آخری لمحوں میں دوڑتے ہوئے یکایک اس نے سوچا کہ بڑھ کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ لے۔ رحم کی بھیک مانگے۔ اس کو بتلائے کہ اس کا تعلق مخالف جماعت سے نہیں ہے ...... اس کا تعلق کسی شے سے نہیں ہے ...... سوا سانسوں کے ...... اور سانسوں سے اپنے تعلق کی بقا کے لیے گرمی کی بھری دوپہر میں وہ چلتی ہوئی سڑک پر جدوجہد کی آگ میں جلنے نکل آیا ہے ......

لیکن اس کا موقع بھی نکل چکا تھا اور اب بچنے کی کوئی کوشش بیکار تھی۔ لڑکے کا ہاتھ نیچے آنے ہی والا تھا ...... اور بم سے اس کے پرخچے اُڑنے والے تھے۔

اس نے آخری بار آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی ساری قوت قدموں میں سمیٹ کر انتہائی تیز رفتاری سے دوڑنا شروع کر دیا۔ اب یہی صورت شاید اسے بچا سکتی تھی ...... لڑکے کے بازوؤں کی قوت کی حد سے وہ نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے مڑ کے دیکھا تو لڑکے نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ اور اب بچنے کی کوئی صورت نہ پاکر ......

اس نے "بچاؤ ...... بچاؤ ......" کی دل دوز گھٹی ہوئی چیخیں مارتے

ہوئے آخری بار متصادم چیخوں کی متزلزل صدائیں سُنیں.......

اور اس سے پہلے کہ مٹھی اس پر کھُل جاتی......

اس سے پہلے کہ ایک دھماکہ کے بعد راکھ اور دھوئیں میں وہ تبدیل ہو جاتا...... متعاقب آنکھوں والے لڑکے نے "گڈ بالنگ......گڈ بالنگ ......کا نعرہ بلند کیا——

وہ جو آدمی ہی تھا اُس کے لڑھکتے ہوئے قدموں پر چیتھڑوں کی ایک چھوٹی سی گیند لڑھکی پڑی تھی —— اکھڑ اکھڑی سانسوں کا مخرج فضائے بسیط میں گم ہو چکا تھا......

—— اور دونوں لڑکے حیرت و استعجاب کی معصوم مورت بنے بیٹھے کبھی آسمان، کبھی گرم فٹ پاتھ، کبھی لڑھکتے ہوئے آدمی کی آنکھوں اور کبھی اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔

حسین الحق

آتم کتھا

میں بھاگ رہا ہوں اور کتے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔

اور بھاگ کر جاتا بھی کہاں کہ اس وسیع و عریض حصار کو مضبوط کرنے کے لئے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں کہ دیوار کے اس پار والوں کو ادھر کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکے اور ادھر کا عالم یہ تھا کہ شہر میں کتے زیادہ تھے اور آدمی کم۔ اس صورت کا ذمہ دار کون ہے؟ شاید میں..... شاید وہ...... شاید تم .... شاید ہم سب ....."

اور اب سب اپنے ہی تیر کے خود شکار۔ نزدیک و دور نظریں دوڑاتا ہوں۔ تو اندر ہی اندر بہت دور تک ناکامی کی تلخی اور سڑاند محسوس ہوتی ہے کہ میں شہر کے بیچوں بیچ ہوں۔ پھر بھی اندھیرے کا یہ عالم ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ ہانپتا کانپتا اندیکھی اور انجانی دشاؤں کی جانب بھاگ رہا ہوں اور پیچھے تعاقب کرتے ہوئے کتوں کے مسلسل بھونکنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ میں حیران

ہوں کہ یہ شہر تو راتوں کو بھی بقعہ نور بنا رہتا تھا۔ پھر آج چاروں اور گھٹا ٹوپ اندھیرا کیوں ہے ؟ کیا میں اندھا ہوں ؟ یا یہ روشنیاں ہی اندھیروں کی خالق ہیں۔

جواب نہ پاکر اندر ہی اندر کوئی سسکتا ہے، روتا ہے اور مسلسل بھاگ رہا ہوں۔

بھاگتے بھاگتے کبھی اپنے جیسے وجود سے ٹکرا جاتا ہوں اور خوشی کے مارے چیخ پڑتا ہوں (گو کہ یہ بھی احساس ہے کہ حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی ہے) اس وجود کے پور پور کو چھو رہا ہوں کہ اس اندھیرے میں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اور بس !

میرے ہاتھ بے تابانہ اسے چھو رہے ہیں ...... لیکن یہ کیا ؟

جب میں اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے پیار کرنا چاہتا ہوں تو میرے ہاتھ دونوں طرف سے آکر خود ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں اور میں خوف سے کانپ اٹھتا ہوں ...... ڈرتے ڈرتے پھر سینے سے آگے ہاتھ بڑھاتا ہوں مگر وہاں کچھ نہیں ہے...... صرف شانوں تک کا انسان جس کا سر غائب ہے۔

"بے سر کا آدمی !" میں آہستہ سے بڑبڑاتا ہوں اور بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔

میں بھاگ رہا ہوں اور کتے میرا پیچھا کر رہے ہیں۔

بھاگتے بھاگتے میں اپنے ہی جیسے کسی وجود سے ٹکراتا ہوں اور خوشی میں اس سے لپٹ جاتا ہوں کہ اس سے تو اپنا دکھ درد کہہ سکوں گا۔ مگر جب میری ٹھڈی اس کے شانوں پر لٹک گئی اور شانے کے حسب دستور خلا میرا مقدر رہا تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کروں ؟

اب کے مجھے پہلے کی طرح اتنے شدید خوف کا احساس بھی نہیں ہوا..... شاید حالات کی کرم فرمائی تھی ـــــــ

میرا سفر جاری رہا، لوگ ملتے رہے، میں انھیں چھوتا رہا، ہر وجود کا پور پور سلامت...... صرف سر غائب!

اور تب ایسے میں شیو میرے پاس آئے اور پوچھا "کیوں رے پگلے کچھ دیکھا ہے؟" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج کچھ نظر نہیں آتا" تو مہاراج بہت زور سے ہنسے اور جاتے جاتے کچھ دیر کے لئے مجھے اپنی تیسری آنکھ ورداں دے گئے۔ اور جب تیسری آنکھ کھلی تو کچھ اور ہی منظر سامنے تھا ـــــــ

وہی ہمارے بے سر کے لوگ جن سے میں ٹکرا چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دکانیں اپنے سینوں میں سجائے گھوم رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا تو ہر دکان میں دکان داروں کے عزیز و اقارب کے کٹے پھٹے اجزا پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا "ان سب کا کیا کروگے؟" تو جواب میں انھوں نے اپنے پیٹ دکھائے۔ میں ان کی مجبوریاں سمجھ گیا اور جیب سے چند سکے نکال کر انھیں دینا چاہا تو انھوں نے پورے جسم کی سرزنش سے انکار کی فضا پیدا کی اور پھر سکوں کی قے کرنی شروع کر دی اور تب میں آہستہ سے وہاں سے کھسک گیا کہ اپنے بس میں اور تھا ہی کیا۔

تو شہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بکھرا ہوا میں اور میرے چاروں طرف بے سر کے انسانوں کا اژدہام اور قے کئے ہوئے سکے اور پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر اور روشنی اندھیروں کی خالق اور بے سر کے لوگوں کی دکانوں میں ان کے عزیز و اقارب کے جسموں کے کٹے پھٹے اجزا تو ایسے میں میرے سامنے ایک ہی راستہ

کھلا ہوا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

میں بھاگ رہا ہوں اور کتے میرا پیچھا کر رہے ہیں

میں بھاگتے بھاگتے ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہوں جہاں کورو پانڈو جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں، دونوں طرف سے تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک طرف کورو۔ اور ایک طرف پانڈو ـــــ اور ان دونوں سے الگ ذرا کنارے پر میں!

میں نے اپنا سر ٹٹولا۔ وہ موجود تھا۔ لہٰذا میں نے دونوں میں کسی ایک کا ساتھ دینا چاہا۔ لیکن اب کے کورو پانڈو میں سے حق کس کے ساتھ ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے اس لیے کہ دونوں طرف بے سر کی فوج ہے۔ سو میں نے آہستہ سے ارجن کو مدد کے لئے پکارا مگر ارجن کے بجائے نارد جی دوڑے آئے۔ کہنے لگے "ارجن کو نسٹ مت دو۔ وہ خود چکرائے ہوئے ہیں۔" اور یہ کہتے ہوئے نارد نے ایک عینک میری طرف بڑھائی۔ میں نے پوچھا "مہاراج گدھ کی عینک آپ نے واپس نہیں کی کہ کیا؟" کہنے لگے "نہیں نہیں میں نے تو واپس کر دی تھی مگر آدمی کا گوشت نہ ملنے کی وجہ سے اس کی بیوی مرگئی تو وہ عینک مجھے دے گیا کہ اب اس کی اسے ضرورت نہیں تھی۔"

نارد جی نے یہ کہتے ہوئے عینک مجھے لگا دی اور میں حیرت میں پڑ گیا ......

کرو چھیتر کے میدان میں دونوں طرف کتے تھے، آدمی کہیں نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے عینک نارد جی کے حوالے کی اور ڈنڈوت کرتے ہوئے کہا کہ "مہاراج آپ تو چلے ہی جائیے ورنہ آپ اپنے ساتھ میری بھی جان لیں گے!"

نارد مہاراج اپنے عینک لے کر آگے پدھارے اور میں بھی چپکے سے وہاں سے کھسک گیا کہ کسی طرف بھی ٹھہرنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اب میری صرف ایک ہی خواہش

تھی کہ کسی طرح اس وسیع و عریض حصار کے آخری سرے تک پہنچوں اور لمبی چوڑی دیوار پار کر کے اس طرف سے لوگوں کو مدد کے لیے پکاروں ۔ میں بھاگتا رہا۔ کتے میرا پیچھا کرتے رہے ۔ کبھی کبھی کچھ کتے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیتے، کوئی پیر پکڑنا چاہتا، کوئی گردن پر حملہ کرتا، کوئی سر کا نشانہ لیتا، کوئی دل کی طرف تاکتا مگر میں پینترے چلتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ بھاگتے بھاگتے کسی نہ کسی طرح دیوار شہر تک پہنچ گیا۔ اب صرف دیوار پار کرنے کا مسئلہ تھا ——

دیوار کافی لمبی چوڑی تھی۔ ایک ہفتہ کے لیے میری ہمت جواب دے گئی مگر پھر اندر کی صورت حال نے یہ دھمکی دی کہ دیوار نہ بھی پار کر سکے تو کیا درون شہر کے یہ کتے تمھیں چھوڑ دیں گے ؟"

بات صحیح تھی لہٰذا میں نے جی کڑا کر کے دیوار پر چڑھنا شروع کیا۔ دیوار چاروں طرف سے سڈول بجل تھی۔ ذرا بھی کہیں کوئی دراڑ نہیں، پھسلن ایسی کہ نہ ہاتھ ٹھہرے نہ پیر۔ مگر کتوں کا خوف میری واپسی کے ارادوں کا قاتل تھا۔ لہٰذا اس بوکھلاہٹ میں کسی نہ کسی طرح دیوار پر چڑھ ہی گیا ——

مگر یہ کسے معلوم تھا کہ دیوار کے اس طرف بھی ایسی ہی صورت حال ہو گی !

اب میں "اس طرف" کی صورت حال آپ کو کیا بتاؤں ؟ بس یہی سمجھیے کہ "اس طرف" اور "اُس طرف" کا جملہ ہی جھوٹ کی پیداوار ہے —— دیوار کے چاروں طرف دور دور تک سمندر...... گہرا آتشیں سمندر...... اور سمندر سے پرے بڑے بڑے میدانوں میں چاروں طرف کتوں کی فوج آدمیوں پر حملہ آور...... اور جو اپنی جان جوکھم میں ڈال کر سمندر میں کود بھی جاتے ہیں۔ انھیں پھر کھولتے کھد کھداتے سمندر سے نکلنا

نصیب نہیں ہوتا۔ .... اور دیوار اسی طرح سڈول، سجل اور پھسلن والی ہے۔

میں نے بہت دیر تک اور بہت غور سے چاروں طرف کی اس صورت حال کو دیکھا اور پھر آہستہ سے اپنی ہی طرف اتر گیا ــــــ

اور تب اسی سمے شیو آگئے اور کہنے لگے "بچہ آنکھیں واپس کر، بڑا سنکٹ کا سمے ہے۔ آدمی اور کتے کی پہچان مشکل ہو گئی ہے!!

اور تب ایسے ہی سمے میں شنکر اپنا کمنڈل بجاتے، ترشول لہراتے اور مکراتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہنے لگے "بچہ اس سارے چھل، کھوٹ، کپٹ اور جھوٹ سے اگر مکتی چاہتا ہے تو وش پی کر امر ہو جا ورنہ کتے تیرا جینا مشکل کر دیں گے۔!"

"نہیں مہاراج اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اپنی جیب سے چھری نکال کر اپنا سر اپنے دھڑ سے الگ کرتے ہوئے مسکرا کر شنکر کو جواب دیا۔

عبد الصمد

اوس اور کرن

اُس رات گرمی بہت تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ تنگ آکر میں نے اپنا حساب کرنے کی ٹھانی۔ بہت دنوں سے اس کا موقع نہیں مل رہا تھا حالانکہ یہ بہت ضروری تھا۔

عالمِ وجود میں آنے کے بعد دُنیا کو دیکھنے سمجھنے میں (NEGLIGIBLE PERIOD) آٹھ برس سونے میں بارہ برس ــــــ بارہ برس

کھانے پینے میں ــــــ ساڑھے تین برس

فکر معاش میں ــــــ بارہ برس

متفرقات (جس میں "بہت سی باتیں" شامل ہیں) ساڑھے چھ برس

جمع ــ چالیس برس

ان سب کا نچوڑ لفظوں اور معانی کا ایک عظیم الشان لشکر، جسے بہرحال اپنی ہی پیٹھ پر ڈھونا تھا۔ حاصل ــ صفر ــ!

میں بہت پریشان ہوگیا۔ اب میں عمر کے نقطۂ عروج سے ڈھلا ہوا ایک انسان

تھا اور دن بدن ڈھلتا ہی جا رہا تھا اور اب تک کا نتیجہ صفر نکل رہا تھا۔
اس کا مطلب یہ ہوا کہ نفی اور اثبات دونوں برابر ——— !

پریشان ہو کر میں باہر نکل آیا اور سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کرنے لگا۔ شہر میں چوراہے بہت ہیں اور اتنے موڑ کہ آدمی چکرا کر رہ جائے۔
ایسی ہی ایک موڑ پر میری اُس سے "ٹکر" ہو گئی۔ ہم دونوں دو مخالف سمتوں سے ایک ہی خطوط پر آرہے تھے اور "ٹکر" ناگزیر تھی!

"ٹکر" میں جھنجھلا اُٹھا اور ابھی کچھ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس نے میرے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا اور بڑے دوستانہ لہجے میں بولا۔

"بگڑو مت دوست! دیکھو میں کہاں بگڑ رہا ہوں۔ آؤ کہیں پُر سکون جگہ پر بیٹھ کر باتیں کریں۔"

اس کے اخلاق اور حسن سلوک سے میں متاثر ہو گیا اور شرمندہ بھی ۔
ابھی ابھی میں اُس پر جھنجھلا اُٹھا تھا ۔ اور چپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا رہا۔
بھلگو ندی کے اوپر بنے پل پر ہم پہنچے ۔ وہ پُل کے جنگلے پر اطمینان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ ایسا کرنے میں خطرہ یہ تھا کہ ذرا سی حرکت سے وہ پل کے نیچے جا گرتا۔ میں نے اُسے خطرہ سے آگاہ کیا۔ تو وہ زور سے ہنسا اور اُسی حالت میں کہنے لگا۔

"رسک لینے سے ڈرتے ہو۔؟ زندگی تو خود ہی ایک جانا بوجھا خطرہ ہے پھر اس خطرہ کو دور کیوں نہیں کر دیتے ؟"

"بے شک خطرہ تو ہے۔ لیکن مزے مزے کا فرق ہے۔ زندگی ایک مزے دار

خطرہ ہے اور ....،،

میں نے اُسے لاجواب کرنا چاہا لیکن، وہ یوں لاجواب ہونے والا نہ تھا۔ میری بات کاٹ کر قہقہہ لگانے لگا۔ میں چڑھ سا گیا اور چپ چاپ پُل کے نیچے کی ندی کو دیکھنے لگا۔ عجب ندی تھی۔ ابھی خشک تو ابھی جل تھل۔ مزاج کا کوئی پتہ ہی نہیں کہ آدمی دھوکا کھا جائے۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

”تم تو ذرا ذرا سی بات میں بگڑ جاتے ہو۔ عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو۔“

”میں چپ رہا، وہ پھر بولا۔

”سُنو سُنو۔ وقت کم ہے اور اسے بھی ہم اگر اپنے مزاج کی مشاطگی میں گزار دیں گے تو پھر رہ کیا جائے گا؟“

”صفر ——— !“

میں فوراً بولا۔

”تب تو اور بھی کمال ہے کہ سب جانتے ہوئے بھی تم ایسا کرو۔ آؤ باتیں کریں۔ دیکھو کتنی حسین فضا ہے، کتنی خوب صورت ندی ہے۔ ایسی خشک اور حسین ندی تم نے دیکھا ہے۔؟“

وہ کچھ جذباتی سا ہو گیا۔

”کس نے کس کو دیکھا ہے۔؟ اس بات کو رہنے ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔“

”تمھاری چمڑی کے نیچے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتا ہے!“

اُس نے میرا مذاق اُڑایا لیکن میں اپنے سابقہ لہجے میں اڑا رہا۔

"کس کی چمڑی کے نیچے کون ہے۔ اسے دیکھنے کے لئے نظر چاہیئے!"

"خیر چھوڑو۔ تم مجھے نقطۂ انجماد پر ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہو، تمھاری باتوں میں ویسا ہی ٹھہراؤ ہے!"

"..........!"

"عورت کے ہاں چلو گے ۔۔؟"

"عورت ـــــــ؟ تم کون سی عورت کی بات کر رہے ہو دوست! میں تو پندرہ برس سے لے کر پینتیس برس تک کی عورت کو جانتا ہوں ۔ جب میری شادی ہوئی تھی تب میری بیوی کی عمر پندرہ سال تھی، اب وہ پینتیس برس کی ہے ۔!"

میں اس عورت کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ اُس عورت کو تو سب کوئی جانتا ہے۔ میں تو اُس عورت کی بات کر رہا ہوں جسے کوئی نہیں جانتا ۔!"

"میں ایسی عورت کے پاس کیوں جاؤں جسے کوئی نہیں جانتا!"

جاننے کے لئے ۔۔ اس طرح تمھاری معلومات میں اضافہ ہو گا ـــــــ!"

معلومات میں اب گنجائش نہیں ۔۔ ان سبھوں کا اتنا بوجھ ہو گیا ہے کہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔"

"بس ۔۔!؟ تم کم ہمت ہو۔ ایسے میں تم سے مجھ سے کیسے نبھے گی ۔؟"

"نبھ جائے گی اگر تم چاہو ۔۔ سمجھوتہ!"

"لیکن سمجھوتے میں تھوڑا آگے پیچھے ہونا پڑتا ہے اور تم ایک RIGID انسان ہو!"

"میں RIGID ہوں لیکن سمجھوتہ کر سکتا ہوں"

اب تک یہی کرتا آیا ہوں۔ یہ RIGIDITY اسی کی تو دین ہے ____!"

"کیا تم نے وہ قصہ سُنا ہے ......؟"

"میں قصہ کہانیوں میں یقین نہیں رکھتا۔ میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں جو کچھ میں دیکھتا ہوں اس سے آگے نہیں جاتا۔!"

"اب تم نے کام کی بات کی ہے۔ کچھ لوگ خواہ مخواہ قصے کہانیوں پر یقین کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر ILLUSION طاری کر لیتے ہیں ____ ایسے ہی لوگ FRUSTRATION کے شکار ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں اُس پر یقین نہیں رکھتے، جو کچھ دیکھتے نہیں اُس پر یقین کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔"

سمجھوتہ ____ سمجھوتہ!"

"اب تم نے عورت کے ہاں جانے سے انکار ہی کر دیا ہے تو پھر رہ کیا گیا۔؟

"اب میں صفر نہیں کہوں گا!"

"نہ کہو ____ لیکن ایک کام کرو ____ آؤ ہم اپنے چہرے بدل لیں ____!"

اس کی آفر سخت تھی لیکن میں سمجھوتے کی بات چھیڑ چکا تھا اس لئے مجھے مان جانا پڑا اور ہم دونوں نے اپنے چہرے بدل لیئے۔ میرا چہرہ اس کے بالکل فٹ آگیا اور اس کا چہرہ مجھے۔ اور تب اس نے مجھے بہت سے واقعات سُنائے۔

نمرود کی خدائی کا ......

فرعون کی فرعونیت کا ......

حسن بن صباح کی جنّت کا ......

قارون کی دولت کا..........

اور پھر ــــــ ہٹلر کا، مسولینی کا ــــــ اور تب موجودہ دور کے نامور ظالموں کا، آگ اور خون کا ــــــ مہلک بموں اور ہتھیاروں کا۔ ظلم وستم کے لئے نئے بابوں کا ــــــ اور ــــــ اور بھی بہت سے قصے.....

ان تمام قصّوں میں مجھے سچائی کا عنصر زیادہ نظر آرہا تھا کیونکہ وہ بہت جوش سے بول رہا تھا اور جوش سے آدمی اس وقت بولتا ہے جب بات اس کے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے اور جو بات دل کی گہرائی سے نکلتی ہے وہ بات سچی ہوتی ہے اور سُننے والے کو سچی لگتی ہے۔

ــــــ اور ان تمام واقعات کو سُن کر مجھے پتہ چلا کہ میری معلومات ناقص تھیں اور وہ مجھ سے بہت زیادہ جانتا تھا۔

اتنی بات چیت کے بعد میری اس سے دوستی ہو گئی اور اب ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر باتیں کرنے لگے۔ بہت سی باتیں جیسے یہ دُنیا بہت ہی حسین، بہت ہی خوب صورت ہے ــــــ یہ ایک خوب صورت باغ ہے۔ گل ہائے رنگ رنگ سے سجا ہوا۔ یہ کسی آرٹسٹ کا ایک عظیم الشان شاہکار ہے ــــــ بہت قیمتی، بہت ہی نایاب چاند ستاروں کی دُنیا کی باتیں تو محض فریب ہیں، حقیقت کی دُنیا تو بس یہی ہے۔ عظیم، عظیم الشان دُنیا...... وغیرہ وغیرہ!

”دُنیا کی حقیقت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے!“

ایک زوردار آواز آئی۔ ہم دونوں چونک گئے۔ ایک دراز قامت، بارعب شخص، سفید لباس میں ملبوس، ہم دونوں کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کے سر پر روشنی

کا ایک مینارہ سا تھا جو جلتا تھا اور بجھتا تھا۔ تب تاریکی چھا جاتی تھی۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔ یہ کہاں سے آ ٹپکا۔؟ اور ہم لوگوں کی باتیں اس نے کیسے سن لیں۔؟

ابھی ہم کچھ پوچھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ شخص مجھ سے مخاطب ہوا۔

اے شخص ! تو ایک گنہ گار انسان ہے کیونکہ تو نے اپنا چہرہ تبدیل کر لیا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تو نے ایسا کیوں کیا۔؟"

بجائے میرے وہ بول اٹھا۔

"تمھیں کسی سے ایسے سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔!

اس شخص نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا اور جواب کا منتظر سا صرف میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھ سے جواب نہیں بن پڑ رہا تھا۔ آخر میں نے سچ بات کہہ دی۔

"ہم نے سمجھوتہ کیا ہوا ہے۔!"

وہ شخص بڑا مغموم سا ہو گیا اور بولا۔

"تیرے سمجھوتے کی بات سن کر افسوس ہوا کیونکہ سمجھوتے کمزور انسان کیا کرتے ہیں۔ کیا تو نے وہ قصہ نہیں سنا کہ جب ایک وسیع و عریض سنسان میدان میں تجھ جیسے ایک انسان پر ایک اژدہا لپکا تھا۔

وہ شخص بھاگا، اژدہا بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ دور ایک نحیف و نزار بوڑھا کھڑا تھا۔ اس شخص نے اس سے پناہ کی درخواست کی لیکن وہ بوڑھا رونے لگا کہ میں ضعیف و ناتواں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا لیکن تو قبلہ رخ چلا جا، شاید کوئی صورت بچاؤ کی نکل آئے۔

وہ شخص قبلہ رخ بھاگا، اژدہا بھی آگ اگلتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا کہ اتنے میں

ایک خندق آگئی۔ اب تو آگے کا کوئی راستہ بھی نہیں رہا اور اژدہا قریب سے قریب تر چلا آرہا تھا، تب خندق سے آواز آئی کہ پیچھے بھاگ۔! وہ شخص پیچھے مڑا۔ تب اس نے ایک اور بوڑھے کو دیکھا، ہانپتا کانپتا اس کے پاس پہنچا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھی مجبور تھا لیکن اس نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہاں بہت سی امانتیں ہیں، شاید تیری بھی کوئی امانت ہو اور وہ تجھے بچا سکے۔ اور تب وہ شخص اس پہاڑی پر چڑھ گیا جو چاندی کا تھا اور جس میں ہر طرف نہریں رواں تھیں۔ ایک چوٹی پر ایک عالیشان قلعہ تھا۔ وہاں اس شخص کی رکھی ہوئی امانت نے اس کی جان بچائی۔

ہم دونوں محو ہو کر سن رہے تھے۔ میرے دوست کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا، ماحول بوجھل سا ہو گیا تھا۔ میرے دوست نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔

"اٹھو چلو یہاں سے۔ ذرا پل کے نیچے چلتے ہیں۔ نیچے کا منظر بڑا حسین ہے....."

لیکن نیچے تو خطرہ ہے۔ کیا پتہ، بالو کی تہہ سے چشمہ ابل پڑے......؟"

"تمھاری یہی عادت مجھے پسند نہیں ہے۔ تم رسک سے اتنا بھاگتے ہو، یہ اچھی عادت نہیں ہے۔ یہی چیز تمھیں لے ڈوبے گی۔"

بات معقول تھی۔ مینارہ والے شخص کی وجہ کر ذہن ایسا بوجھل ہو گیا تھا کہ میں نیچے جانے ہی میں عافیت سمجھی لیکن دفعتہً وہ شخص چلا اٹھا۔

اے انسان! کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے دوست ایسے کمزور ہیں کہ وہ تجھے خوفناک اژدہے سے بھی نہ بچا سکیں۔؟"

"نہیں ــــ!"

"نہیں تو پھر کیا تو یہ چاہتا ہے کہ تیرے دوست ایسے کمزور ہیں کہ وہ تجھے راہ بھی نہ سمجھا سکیں۔!"

"نہیں نہیں ــ!"

میں چیخ پڑا۔

"کیا تونے اپنی کوئی امانت رکھی ہے۔؟"

"نہیں ــــ!"

"نہیں تو پھر تو اپنے اس دوست کو مار ڈال۔ حملہ کر دے اس پر۔ یہ تیرا دشمن ہے۔!"

اُس شخص نے مجھے ترغیب دلائی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ یہ تو میرا بہت ہی اچھا دوست تھا۔ اُس نے مجھ سے بہت سی میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں، اُس نے مجھے بہت سے قصّے سُنائے تھے اور وہ مجھے نیچے جانے کو کہہ رہا تھا تاکہ میرے بوجھل ذہن کو عافیت ہو۔ اب میں اُس سے جھگڑ پڑوں، عجب سی بات تھی مضحکہ خیز سی ــــ لیکن مینارہ والے شخص نے حملہ کرنے کی بات اتنی بار کی کہ میں کچھ سمجھے سوچے بغیر اُس پر پل پڑا

اور پھر ــــ اُف!

کس قدر طاقت ور تھا کم بخت ــ! میری ہڈی، پسلیاں ایک ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں بھی اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن بھلا اس کا میرا کیا مقابلہ۔؟

مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اس سے لپٹ پڑا۔ نہ دشمنی نہ عداوت۔

مجھے مینارہ والے شخص پر غصّہ آنے لگا کہ اس نے مجھے یوں لڑا دیا اور پھر اپنے پر غصّہ آنے لگا کہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کیوں لگایا اور کیوں خواہ مخواہ جھگڑ پڑا ــــ

اب مرو کم بخت !

کافی دیر کی نبرد آزمائی کے بعد اتنا ہوا کہ ہم دونوں بے دم ہو گئے اور اتنے بے حال ہوئے کہ حرکت کی بھی سکت نہ رہی اور تھک ہار کے ایک دوسرے سے دور جا گرے۔ اب جا کر معلوم ہوا کہ اس بیچ ہم دونوں کے چہرے اپنی اپنی جگہ پر آ گئے تھے۔

کافی دیر تک ہم لوگ یوں ہی پڑے رہے۔ مینارہ والا شخص غائب ہو چکا تھا اور رات آہستہ آہستہ گزر رہی جا رہی تھی۔ مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ میں اُٹھ کر جا سکتا۔ یہی حال اس کا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب صبح آئے گی، جب سورج آئے گا، جب زندگی آئے گی تب ہم دونوں نہیں روند نہ ڈالے جائیں۔۔!

لیکن جب صبح ہوئی، جب سورج آیا۔ جب زندگی آئی تو ہم دونوں روندے نہیں گئے، بلکہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس کا وجود بھی غائب ہو گیا، یوں جیسے گھانس کی پتیوں میں سے شبنمی قطرے غائب ہو جاتے ہیں اور اسی کرن نے میرے اندر اتنی حرارت پیدا کر دی کہ میں اُٹھ کر جا سکوں ـــــــــ اور میں مرے مرے قدموں سے چل پڑا +

انور قمر

گرمی

ایک بے ضرر سی پھنسی چند روز میں گھاؤ کی شکل اختیار کر چکی تھی اور وہ گھاؤ اب ایک رستے ناسور میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک کیکڑا نما ناسور کہ جس کے بیچ میں ذرا سا شگاف تھا اور اس شگاف کے اطراف کی جلد سخت ہو چکی تھی اور سرخ بھی۔

بھاری پیروں سے وہ پیشاب خانے کے باہر آیا۔ قینچی مارکہ سگریٹ جیب سے نکال کر منہ سے لگائی۔ پھر ماچس نکالی۔ ماچس خالی تھی ... اس کی ماں ..... اس نے ڈبیہ داہنی طرف اچھال دی۔

بائیس روڈ کے ناکے پر واقع بیڑی والے کی دوکان پر جوٹ کی سلگتی رسی سے اس نے سگریٹ سلگایا اور وہیں کھڑے کھڑے دو کش لیے۔ بھاری پیروں سے وہ آگے بڑھا اور بائیں طرف سکولاجی اسٹریٹ میں مڑ گیا۔ سڑک کے بائیں طرف داؤد باغ تھا اور دائیں طرف تھے ویشیاؤں کے کٹھرے۔ چھوٹا سا

داخلی دروازہ، اندر اونچا پلنگ، پلنگ پر میلے کچیلے چیکٹ گدّے، گدّوں پر گہرے رنگ کی چادر۔ آڑی ٹیڑھی صورتوں کی عورتیں، تنگ بلاؤز اور گھیردار لہنگا پہنے، راہ گیروں کو تاکتی اُسے نظر آئیں۔ ان کی ماں۔۔۔۔۔ مادر۔۔۔۔۔ نے میری زندگی تباہ کرکے رکھ دی۔ آخ۔۔۔۔۔ تھ کی آواز بہت کھینچی۔ پھر اس نے تھوک کر کے بہت سا بلغم ان کی طرف تھوک دیا۔

"اُس بھڑوے کو دیکھو۔" ایک نے ہاتھ لہرا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ حرام کے جنے کا کچھ کھایا ہو جیسے!"

دوسری نے مسکرا کر اُس کی حرکت نظر انداز کی اور پیشہ ورانہ انداز میں ربر کے کتّے کی طرح گردن اوپر نیچے ہلانے اور لہنگا بھی اُچکانے لگی۔

وہ خوں خوار نظروں سے انھیں گھورتا آگے بڑھ گیا۔

"آجا میری برباد محبت کے سہارے، ہے کون جو بگڑی ہوئی تقدیر سنوارے"۔

نور جہاں بہ آواز بلند فریاد کر رہی تھی۔ سائیکل کی دوکان پر پہیے کے گھیرے کی گولائی ٹھونک ٹھونک کر درست کی جا رہی تھی۔ پسینے میں تر ایک بوڑھا کبابی کچے قیمے کی ٹکیاں ہتھیلی پر جما جما کر کڑکڑاتے تیل میں چھوڑ رہا تھا اور ٹکیاں بلبلوں میں بھوری ہوتی جا رہی تھیں۔

اپریل کا مہینا ـــــ دوپہر کا وقت ـــــ بمبئی کی گرمی ـــــ پسینے کی پتلی سی دھار اسے اپنی پیٹھ پر بہتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کسمسا کر جلد سے چپکی ہوئی نائیلون کی قمیص اس نے الگ کی۔

دفعتاً اسے اپنے جسم کے اس مخصوص عضو پر بیٹھے سنگین پیٹھ والے کیکڑے کا

پھر خیال آیا ــــ آخر مجھے کب اس کیکڑے کی مہلک گرفت سے نجات ملے گی؟
وہ تو ایک بے ضرر سی پھنسی تھی۔ چند روز میں اس نے ایک گھاؤ کی شکل اختیار کرلی اور پھر وہ گھاؤ ایک رستے ناسور میں بدل گیا ــــ اف کتنا بدبودار فاسد مادہ خارج ہوتا ہے اس سے! کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے جسم کی تمام قوت قطرہ قطرہ ہو کر اس راہ بہہ نکلے۔

اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی ــــ سر کا پسینہ گردن پر سے گزرتا ریڑھ کی ہڈی پر ٹھنڈا ٹھنڈا پھر سے بہنے لگا ــــ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے۔ اور جسم بالکل بے وزن سا محسوس ہونے لگا ــــ

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی راہ کیوں کر طے کر رہا ہے...... خیراتی اسپتال کی راہ ...... اس کے لاشعور میں اس اسپتال کا سنگین اور بے حس وارڈ سینکڑوں کراہتیں لئے موجود تھا ــــ لمبی قطار ــــ لمبوترے چہرے ــــ لمبوتری ناک ــــ لمبوترے دانت، لمبے بالوں، لمبے ناخونوں اور لمبی بیماریوں کے ساتھ مریض ــــ پندرہ لاکھ یونٹس کی نیل آمیز پینی سلین پام......" سالے انجکشن کاہے کو لیتا ہے ــــ یہ طلسم لے جا ــــ اور لگا اس پر ــــ جلدی اچھا ہو جائے گا ــــ دیکھتا نہیں ہو ــــ کتنی جاڑی سوئی مارتا ہے وہ کھڑوس ڈاکٹر؟"

"آ...... آہ......"

ایک دبی دبی سی چیخ انجکشن لیتے ہوئے مریض کے منھ سے نکلی۔ ڈاکٹر نے ابھی ابھی اس کے بازو میں سوئی گھونپی تھی۔

اسماعیل لرز کر رہ گیا ـــــ ایک روپے کا نوٹ اپنے مخاطب کو تھما کر وہ اس انجکشن کی سربمہر شیشی گھر لے آیا۔

رات میں کھانا کھانے کے بعد وہ پاٹ اٹھائے جب اپنی بھاری پیروں سے پاخانے کی اور چلا تو اس کے پاجامے کی جیب میں وہ شیشی جھول رہی تھی۔ ـــــ آٹھ دس کمرے چھوڑ کر چالی کی لڑکیاں ایک دوسرے کی چونچ میں چونچ دیئے بیٹھی تھیں ـــــ جب وہ ان کے قریب سے گذرا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیں۔ اس ہنسی کے ساتھ ساتھ ان کے جسموں سے اٹھتی ہوئی کچے آموں کی خوشبو بھی اس کی حسوں سے ٹکرائی ـــــ اس کے ذہن کے کسی حصہ پر کھٹ سی گری ـــــ اچانک اس کے دامن میں اُبھار پیدا ہو گیا ـــــ اس کا جی چاہا کہ چالی کی یہ نیم تاریک راہ لمبی اور لمبی ہوتی چلی جائے ـــــ اور جہاں یہ ختم ہو، وہاں ہو کھلا میدان ـــــ اور ہمارے آسمان پر ہوں ستارے اور اس کی گردیں ہوں آم کی یہ پٹاریاں۔

پہلی دوسری اور پھر تیسری شیشی کا مرہم وہ اپنے زخم پر مسلسل لگاتا رہا اور آٹھ دن تک اس کا چمتکار دیکھنے کا منتظر رہا۔ لیکن جو زہر خون میں حل ہو کر اس درخت کی جڑوں میں پرورش پانے والے جرثوموں کو فنا کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا، وہ کیوں کر اس کی شاخ کے زخم پر ایک اکسیر مرہم کا کام کر سکتا تھا۔ وہ قطعی بے اثر ثابت ہوا۔

اس نے جیب سے دوسری قینچی نکالی۔ ایک بیڑی کی دوکان پر جلتی چمنی میں کانپتی انگلیوں سے تھامی ہوئی کترن ڈبوئی اور پھر اس کی مدد سے اپنا سگریٹ

سُلگایا۔

لمبا کش ـــــ جس کے سرور سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

سڑک پر اطراف کی تمام گلیوں اور محلوں کا کوڑا ڈھیر تھا ـــــ بدجانوروں سے مشابہت رکھنے والے بچے اس ڈھیر کو کُرید رہے تھے ـــــ وہ اوبڑ کھابڑ فٹ پاتھ پر چلنے لگا ـــــ

ایسی ہی ایک دوپہر تھی جب وہ گھر سے بیگن کا بھرتہ، ماش کی پھریری دال اور تہاری کھا کر کارخانے کو لوٹ رہا تھا اور ایک کسے بدن کی سانولی سلونی عورت سے اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کئے جا رہا تھا ـــــ وہ بھی دانتوں میں پلّو لئے اس سے کوئی گمبھیر معاہدہ کر رہی تھی۔

اس کے کانوں کی لویں گرم ہوگئیں ـــــ جلدی سے اپنی قمیض کا دامن کھینچ کر پتلون سے باہر کر لیا۔

پھر تو کارخانے کو آتے جاتے وہ اس سانولی سلونی کسے بدن کی عورت کو تاکا کرتا ـــــ

اور ایک دن صبح سویرے کہ جب وہ ڈیوٹی کو جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے بالوں سے پانی جھٹک رہی ہے اور اس کی بغل میں دو موٹے موٹے سفید کبوتر دبے ہیں ـــــ ایک لمحہ کے لئے وہ وہیں رک گیا۔ اسی لمحہ اس کا تصور اسے اس عورت کے پاس لے گیا اور جاتے ہی اس نے ان کبوتروں کو اپنی دونوں مٹھیوں میں بھر لیا ـــــ اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں ـــــ آنکھوں کے سامنے مخملی اندھیرا سا چھا گیا ـــــ سرخ، ہرے، پیلے، سنہری رنگ اس

اندھیرے میں ایک دوسرے لپٹنے لگے ـــــ

وہ اپنے خیالوں میں کھوئی بالوں سے پانی جھٹک رہی تھی کہ اچانک اسے محسوس ہوا کہ کسی کی نظریں اس کی بغل میں پیوست ہوئی جارہی ہیں۔ تیزی سے الگنی سے تولیہ کھینچ کر، اس نے اپنے سینے پر ڈال لیا ـــــ اور پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرائی۔

پھر تو وہ کبوتر وہاں سے اُڑے اور اُس کے سر پر ایک ہمزاد کی طرح پرواز کرنے لگے۔ کبھی وہ اسے کسی عمارت پر بیٹھے نظر آتے، تو کبھی کسی کی دوکان پر ـــــ کبھی اس نے انھیں کسی راہ گیر کے سر پر بیٹھا دیکھا تو کبھی کسی موٹر کے مڈگارڈ پر ـــــ پریشان تو وہ اس وقت ہوا کہ جب وہ کبوتر اسے اپنے کارخانے میں مستری کی میز پر بھی بیٹھے نظر آئے۔

بے بس ہو کر اس نے چھٹی لینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ آج کام پر قطعی دھیان نہیں دے سکتا ـــــ اس لئے اپنی بہن کی نسبت طے کئے جانے کے موجود رہنے کا بہانہ بنا کر اس نے چھٹی لی اور سنٹرل اسٹیشن کے ایک ویران پلیٹ فارم پر بچھے بنچ پر جا بیٹھا۔

وہ کبوتر اب پلیٹ فارم پر اتر آئے تھے ـــــ کبھی وہ اُڑ کر چھت پر جا بیٹھتے تو کبھی ریل کی پٹری پر! دو موٹے موٹے سفید کبوتر!

نہیں، یہ بدکاری مجھ سے نہیں ہوگی ـــــ وہ رنڈی ہے۔ بری عورت ـــــ لیکن کتنی خوبصورت ہے وہ ـــــ اور اس کا جسم ـــ اف ـــ اور وہ کبوتر ـــــ بڑے بڑے سفید کبوتر ـــــ نہیں نہیں یہ گناہ ہے ـــــ برے لوگ ہی ان کے پاس

جاتے ہیں ـــــ لیکن وہ کتنے پیار سے مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اور وہ کبوتر، ایسے کبوتر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے ـــــ ایسے کبوتر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے .... ایسے کبوتر ......

ایک دم دار ستارہ فلک کے کسی حصہ سے ابھر کر اس کے سامنے آیا ـــــ آں ـــــ ہاں ـــــ قدسیہ خالہ ـــــ جھولے پر ہم بچوں کے بیچ بیٹھا کرتی تھیں ـــــ ان کے بازو ہمارے شانوں پر ہوتے تھے ـــــ اور جب کبھی کوئی بات انھیں لطف دے جاتی تو ایک پھلجھڑی سی چھوٹتی ان کے منھ سے اور پھر وہ ہمیں کس کر اپنے سینے سے لگا لیتیں ـــــ کبوتر دب جاتے ـــــ اور ہمیں ان کا گداز اور گرم لمس کتنا اچھا لگتا ـــــ ایک مرتبہ تو وہ میرے خواب میں بھی آتی تھیں ـــــ ایک راج کماری کے روپ میں۔ تو کیا میں اسے ان کا بدل سمجھوں؟ نہیں ..... نہیں ...... قدسیہ خالہ ...... اس سے بڑھ کر اور کون سا گناہ ہو سکتا ہے۔

ایک خالی ریل گاڑی دو پلیٹ فارم چھوڑ کر تیسرے کے احاطے میں دبے قدموں داخل ہوئی۔ اسماعیل کو اس کی بات یاد آئی۔

وہ بستر پر آنکھیں بند کیے دراز تھا اور اس کے والد کہہ رہے تھے:

"کوشش میں ہوں کسی اچھے علاقے میں کوئی جگہ مل جائے۔ یہاں تو چاروں طرف رنڈیوں کے کوٹھے ہیں۔ راہ چلنا دشوار ہے ـــــ قدم قدم پر بھڑوے راستہ روکتے ہیں ـــــ اب اسماعیل جوان ہو چکا ہے ـــــ پتہ نہیں کب قدم بہک جائے اس کا!

اس کی ماں نے انھیں پان پیش کرتے ہوئے کہا:

"نہیں جی، اتنی فکر مت کیجئے ـــــ اسمٰعیل بہت سمجھدار ہے۔ وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کرے گا۔"

"تو کیا یہ کوئی غلط کام ہے؟ چوری، دھوکہ بازی، بے ایمانی جیسا؟ لیکن اس آتش فشاں کا لاوا جو کھول کھول اٹھتا ہے؟ آخر کب تک میں اسے اپنے ہاتھوں کی راہ بہاتا رہوں؟ اپنے مخرج سے نکل کر کبھی تو یہ سمندر میں گرے! کب ...... کب ...... وہ کبوتر ...... وہ سفید کبوتر ...... بغیر کوئی فیصلہ کیے وہ وہاں سے رخصت ہوا۔ اس وقت اسٹیشن کے گھڑیال میں ایک بج رہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے کھانا کھایا اور طبیعت میں گرانی کی وجہ ماں کو بتا کر بستر پر لیٹ گیا ـــــ وہ کبوتر اس کے کان میں غٹرغوں غٹرغوں کرتے رہے اور مستی میں آکر رقص کرتے رہے۔

کوئی چھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے ماں سے نہانے کا پانی گرم کرنے کی درخواست کی اور خود دیوار سے ٹیک لگائے بستر ہی پر بیٹھا رہا ـــــ چال میں چہل پہل تھی ـــــ وہ لڑکیاں ٹھٹھا مار کر ہنس رہی تھیں ـــــ جب کوئی اس کے کمرے کے سامنے سے گذرتی تو ایک نظر اندر بھی ڈال دیتی ـــــ اور وہ سوچتا اس آم کی پٹاری سے کتنی مہک اُٹھ رہی ہے۔

نہاتے ہوئے اس نے اپنے آپ پر بہت قابو رکھا۔ ان لمحوں میں کبوتروں

کو مٹھی میں بھینچ لینے کی خواہش بڑی شدید تھی لیکن اس کی ہزار ہاں، پر آج صرف ایک نہیں، بھاری تھی ـــــــ ایک گھنے بالوں والا ہاتھ بار بار اس طرف بڑھتا اور یہ اپنی پوری قوت صرف کر کے اس ہاتھ کا رخ موڑ دیتا۔

نہا دھو کر سر میں تیل ٹپکا کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنانے لگا تو اسے اپنے چہرے پر خلاف معمول بڑی تمازت اور تازگی نظر آئی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ آج اس نے اس ریچھ کو اپنے پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ اس کا پنجہ مروڑ کر اسے شکست دے دی۔

لیکن ـــــــ نہ جانے کس سمت سے وہ سفید کبوتر کمرے میں آ دھمکے اور آئینہ کے اوپری سرے پر جا بیٹھے ـــــــ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا ـــــــ کانوں کی لوؤں سے خون ٹپکنے لگا ـــــــ ہاتھ کانپنے لگے۔ جسم اینٹھنے لگا ـــــــ "نہیں ..... نہیں ....." وہ بڑبڑایا۔ میں انھیں مات نہیں دے سکتا۔ میں ان کے سامنے اپنے آپ کو بے حد پست ہمت اور حوصلہ شکن پاتا ہوں ـــــــ

ماں کی پروسی ہوئی چائے پی کر وہ گھر سے باہر نکلا ـــــــ مکان کی چھتوں اور کارخانوں کی چمنیوں کے درمیان میں کھڑے ناریل کے درخت پر اس کی نظر پڑی۔ درخت ہوا میں ڈول رہا تھا ـــــــ اور اس پر وہ کبوتر بیٹھے ہوئے تھے ـــــــ

"اللہ اکبر" جوں ہی اذان ہوئی ان کبوتروں نے قلانچ ماری اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئے ـــــــ کہاں چلے گئے؟ ـــــــ کہاں چلے گئے؟

ان کے جانے سے اسے بہت خوشی ہوئی۔ مانو سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا ـــــــ سینے پر سے بھاری پتھر اٹھ گیا ـــــــ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے عبادت اور بندگی سے

مجھ میں یقین کی قوت اور ایمان کی گرمی از سرِ نو پیدا ہو جس کی بدولت میں ان نفس پرور پرندوں سے نبرد آزمائی کر سکوں۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ گئے۔

وضو کر کے بڑے خضوع و خشوع سے وہ نماز ادا کرنے گیا۔ فرض کی ادائیگی کے دوران میں خالق کائنات سے اپنا ناتہ جوڑتے ہوئے وہ اپنے آپ کو کمتر اور ذلیل محسوس کرنے لگا ـــــ اس عظیم المرتبت، عظیم القدر، عظیم الشان ہستی کے آگے اس نے اپنے آپ کو بے مایہ، بے کس، بے وقعت اور شرمسار پایا۔

ان تین رکعت نماز کی ادائیگی کے بعد اسے اپنے قلب پر بے پناہ سکون محسوس ہوا ـــــ جس کی راحت کے زیر اثر دعا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

کچھ دیر رک کر اس نے دو رکعت سنت پڑھی ـــــ

اور

جب وہ آخری دو رکعت نفل پڑھنے بیٹھا تو وہ کبوتر سجدہ گاہ سے نمودار ہوئے اور ممبر پر جا بیٹھے ـــــ

انھیں دیکھتے ہی اس کے اعضا شل ہو گئے اور جسم بے وزن محسوس ہونے لگا۔

مسجد سے اس کے قدم باہر نکلے تو اس کا رخ اپنے مکان کی طرف نہیں تھا۔

اس بات کو گذرے ہوئے دو مہینے بیت چکے تھے

آج اسمٰعیل اسی راستے خیراتی اسپتال کو جا رہا تھا ـــــ اور دو کبوتر بہت بلندی پر اس کے سر پہ پرواز کر رہے تھے۔

▲▲

شفق

نچا ہوا گلاب

شادی کے صرف تین ماہ بعد اچانک میرے دونوں شانوں میں آگ لگ گئی اور گذرتے دنوں کے ساتھ وہ آگ اتنی شدّت اختیار کر گئی کہ مجھے لگتا ہے میں اپنے دونوں شانوں پر دہکتی ہوئی دوزخیں لئے گھوم رہا ہوں، آگ، شعلے اور چنگاریاں، روشنی اور اتنی تیز روشنی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔ جانا کہیں ہوتا ہے، منزل کہیں ہوتی ہے، مگر راستے پہچانے نہیں جاتے۔ منزل پر پہنچ کر حیرانی کا لمحہ اور پھر نئی جستجو، ٹٹول ٹٹول کر طے کئے جانے والے راستوں کا لمس، کنکریاں، سنگریزے، لہولہان پاؤں، لہولہان دل، آنکھوں کی روشنی کو ایک نقطے پر مرکوز کر کے میں نے بارہا سفر شروع کیا ہے مگر کچھ دور چلنے کے بعد ہی گمرہی کا احساس جاگ اٹھتا ہے تو پھر واپسی کا سفر۔

میں نے تو داہنے شانے پر رنگین اور مہکتے ہوئے پھولوں کے باغ لگانے چاہے تھے اور اس فکر میں جنگلی گلاب اور بے بو لتردار پودوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔

قصور میرا نہیں، اس تیز دو رخی روشنی کا ہے جس نے اچھے اور برے کی تمیز چھین لی ہے ورنہ وہ معمولی سی ملازمت تو ہمارے چھوٹے سے خاندان کے لئے ابرِ رحمت تھی، خنک چاندنی تھی، دسمبر کی دھوپ تھی، ہمارا سب کچھ تھا۔ اپنے خوابوں کی تکمیل کے لئے میں نے اسے چھوڑ دیا کیونکہ یہ جنگلی پھول اور لتردار پودے میرے خوابوں کی تعبیر نہیں تھے۔ وہ رنگین خواب جو دل کی گہرائیوں میں کئی سالوں سے مچل رہے تھے، وہ سپنے جو ہم دونوں نے بار بار دیکھے تھے، اب ان میں رنگ بھرنے کا زمانہ آیا تھا۔ چھ ماہ پہلے ایک سہانی سی شام اُسے سُرخ جوڑے میں لپیٹ کر ہمارے گھر لے آئی۔

میرا خواب، میری خوشیاں، میری تمنا میری آغوش میں تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں نے اُسے خدا سے مانگ کر سب کچھ مانگ لیا اور خدا نے اُسے دے کر سب کچھ دے دیا۔

صبح ہم دونوں نے اپنے آنگن کو غور سے دیکھا۔

سیم، کدو کی لتیں، انار اور پپیتے کے درخت، بیلے کی اُجڑی ہوئی شاخیں، جنگلی گلاب۔

آپ نے بھی غضب کیا، گھر کو جنگل بنا دیا ہے۔ ان جنگلی گلابوں میں خوشبو نہیں ہوتی اور یہ سیم کی لتیں آپ دیکھئے گا، میں اس آنگن کو مہکتا ہوا باغ بنا دونگی۔ یہاں گھڑونچی کے نیچے رنگ برنگے گلاب کی کیاریاں، نل کے بغل میں چنبیلی کا درخت، دروازے کے پاس جوہی کی لتیں، یہاں بیلا، کروٹن اور موسمی پھول۔

میں تنہا کیا کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی بدذوقی کا احساس ہوا۔

مگر جنت کی تعمیر میں مجھے تنہا نہ چھوڑ دیجئے گا۔

ہمارے خواب مشترک ہیں تو پھر اس کا کیا سوال۔

ماں نے گہری نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا، اُس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا، منہ سے تو کچھ نہیں بولی، خموشی سے چھالیاں کترتی رہی مگر اس کے کان ہماری باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

کمرے کی دیوار سے نمک لگی مٹی جھڑ رہی ہے، اگر آپ ایک اینٹ کی دیوار اُٹھوا کر پلاسٹر کرا دیں تو وہ نہ صرف ڈرائنگ روم بلکہ ہمارا بیڈ روم بھی بن جائے۔ ایک طرف ٹیبل کرسیاں دیوار سے سٹا کر مسہری اور مسہری کے سرہانے کتابوں کی الماری، تپائی اور ٹیبل لیمپ ......

میں نے ماں کے چاندی جیسے بالوں کی طرف دیکھا، پھر چھپّر کی طرف پھر اپنی بیوی کی طرف، پھر آسمان کی طرف۔ اب کے برسات بڑی زوردار ہے، آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں، ان بادلوں کے اندر چھپا ہوا سورج کتنا پریشان ہوگا۔ کتنا تھکا ہوا، کتنا اُداس، مگر سفر مقدّر ہے اس لئے نکل کر غروب ہونا ہے، غروب ہو کر پھر نکلنا ہے، مگر میں تو تھکا ہوا سورج نہیں کہ میں نے ایک بار بھی، اپنے اندر کسی بے چین لہر کا دُکھ نہیں جھیلا تھا، کبھی کوئی لہر کسی چٹان سے نہیں ٹکرائی، کبھی زمین نے قدم نہیں تھامے، کبھی راستوں میں گری ہوئی دیواروں کے ملبے نہیں ملے، اور میں جانے پہچانے راستوں پر آہستہ آہستہ چلتا رہا ہوں مگر اب میرے اندر کی پُرسکون جھیل بارش کی زد میں ہے، اب مجھے طلوع ہونا ہے تاکہ پیار کی شبنم سورج کی روشنی میں قوسِ قزح

میں نے بیوی کی طرف دیکھا، وہ مسکرا رہی تھی۔

سب ٹھیک ہو جائے گا تم اسی طرح مسکراتی رہو۔

دن گذر جاتا، راتیں آتیں، گہری سیاہ راتیں، شاید اُس کی زلفیں بکھر کر رات کو اور گہرا کر دیتی تھیں، اُس کے ہونٹوں کے دیے روشن ہو جاتے اور پھر نشیب و فراز کا سفر، سر ہوتی ہوئی بلندیاں اور پستیاں، جانے انجانے راستے اور .....

آپ ایم۔ اے کیوں نہیں کر لیتے۔

ایم۔ اے۔ کیوں؟

مجھے کالج کے پروفیسر بہت اچھے لگتے ہیں۔ میرے محلّے میں راحت صاحب ہیں نا، کتنی عزت ہے اُن کی۔ سب انھیں جھک کر سلام کرتے ہیں اور اسکوٹر کی آواز سن کر سب سمجھ جاتے ہیں کہ ...... تب آپ بھی اسکوٹر سے آئیں گے اور اسکوٹر کی آواز سن کر میں آپ کو دروازے پر ریسیو کروں گی۔

گلاب کی جڑ کی سطح ملائم کرتے ہوئے میرے ہاتھ رک گئے ہیں۔ میں نے الگنی پر ٹنگی ہوئی چادر کی طرف دیکھا، پھر اپنی سائیکل کی طرف جو کئی سالوں سے میری رفیق تھی مگر جس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا تھا اور چوں چوں چرر چرر کی آواز کسی اسکوٹر سے کم نہ تھی۔

ایم۔ اے، ..... پروفیسر ...... اسکوٹر ...... کلاسز اور لیکچر .... لڑکوں کی بھیڑ بھاڑ، غالب، مومن، میر اور اقبال، کرشن، بیدی، منٹو، عصمت، سیلاب کی تباہ کاریاں، سائنس کے کارنامے، ہماری آزادی اور ہم دروازے پر لگی ہوئی نیم پلیٹ۔

میری بیوی کی آنکھوں میں التجا تھی۔

مگر ایم۔ اے کر لینے کے بعد کیا پروفیسری مل جائے گی؟

آپ تو افسانہ نگار ہیں۔

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے تو وہ گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی بیل بن کر لپٹ گئی۔

اور جس دن ہمارے آنگن کے گلابوں میں پھول کھلے، میں نے اُسے بتایا، ڈالیوں کے اِن گلابوں سے بہتر تو تمہارے گالوں کے گلاب ہیں۔

ہٹئے بھی۔

یقین نہ ہو تو یہ دیکھو۔ میں نے گلاب کا پھول اُس کے گال پر رکھ کر آئینہ سامنے کر دیا اور اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

سنئے جی، ہمارے یہاں منّا ہو گا تو......

تمہیں بچّوں کا بہت شوق ہے۔

ہر عورت پہلے بیوی بننا چاہتی ہے پھر ماں۔

مگر تمہاری جڑیں تو پہلے ہی دل کے اندر دفن ہیں، کیا تم خوف زدہ ہو؟

خوف زدہ...... نہیں تو...... میں مکمل ہونا چاہتی ہوں۔

مگر میں تو کچھ سالوں تک اپنی مملکت کے بٹوارے کے حق میں نہیں ہوں۔

خلوت میں شوخ تبسّم کے جلتے دیوں کے درمیان ایک ہنگامہ خاموش، کتابیں، نوٹس اور کاپیاں، آنگن میں کھلتے ہوئے گلاب، پرواز کے لئے پھڑپھڑاتے ہوئے بازو، خوابوں کے نئے باب، تخیل میں اسکوٹر کی بھر بھراہٹ اور کلاس میں لکچر، رگوں میں بوند بوند اترتی ہوئی ہونٹوں سے نچوڑی ہوئی توانائی، مگر بائیں شانے سے چنگاریاں

اٹھنے لگی تھیں۔

ماں خموشی سے چھالیاں کترتی رہتی مگر اُس کی آنکھوں میں بادل خیمہ زن ہو گئے تھے اور میں ڈر رہا تھا یہ بادل کب برسیں گے اور برسیں گے تو کیا ہو گا، سیلاب آئے گا اور گلابوں کی جڑیں سڑ جائیں گی، طوفان اُٹھے گا اور جوہی کی شاخیں جھلس جائیں گی۔ طوفان کب آئے گا؟ بادل کب برسیں گے، بجلیاں کب گریں گی۔

ماں میرے شانے میں شدید درد ہے۔

موسم خراب ہے بیٹا، اور ابھی اور خراب ہو گا۔ تم ابھی سے احتیاط کرو ورنہ یہ شانے کا درد، میں تیل گرم کر کے مالش کر دوں؟

رہنے دو ماں، آشی سے کرا لوں گا۔

آشی سے...... ماں نے طویل سانس لی۔ تو مجھے بارش کا شور کہیں قریب ہی سنائی دینے لگا اور میں جلدی سے اُٹھ گیا کہ مجھے کتابیں بلا رہی تھیں۔

مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ آپ فرسٹ کلاس سے پاس کریں گے۔ آشی مجھے پاگلوں کی طرح چوم رہی تھی۔ اُس کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر مجھے پھر گلابوں کا خیال آیا۔

ہماری ہر تمنا اسی طرح پوری ہو گی۔

مگر شادی کو پانچ ماہ ہو گئے مگر ابھی تک......

میں ایک سال تک اپنی مملکت کی حفاظت کروں گا۔

آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں۔

بعد میں پچھتانے سے کیا ہو گا۔

مقامی کالج کے پرنسپل نے میری ڈگریاں دیکھیں، پبلشڈ ورک دیکھا اور مطمئن

انداز میں سر ہلا کر کہنے لگا۔ بہت خوب، میرے یہاں ایک جگہ خالی ہے، آپ جوائن کر سکتے ہیں مگر......

میرا دل دھڑکنے لگا۔ کہیے سر، مجھے خدمت کر کے خوشی ہو گی۔

بات یہ ہے کہ یہ ایک نیا کالج ہے، اس لئے آپ کو اپنی چھ ماہ کی تنخواہ کالج فنڈ میں کرنی ہو گی۔

چھ ماہ کی مگر......

سب نے ایسا ہی کیا ہے، آپ کو منظور ہو تو ٹھیک ورنہ......

چھ ماہ پلک جھپکتے گذر جائیں گے۔ آشی نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے سمجھایا۔ پھر سوچئے تو ایک شاندار مستقبل کے لئے کیا یہ قربانی بہت ہے، جب کہ لوگ برسوں ٹھوکریں کھاتے ہیں ——

کلرک سے پروفیسر تک کا سفر اتنی آسانی سے طے ہو گیا کہ میں حیران رہ گیا۔ کہاں وہ دفتر میں صاحب کی پھٹکار اور کہاں آپ سے آپ پھٹتی ہوئی بھیڑ، گڈ مارننگ سر، پرنام سر، آداب سر، دروازے پر نیم پلیٹ لگ گئی۔

مگر میرے دونوں شانے یکبارگی سلگ اُٹھے۔ دو ماہ کا عرصہ گذرتے گذرتے گلابوں میں آگ لگ گئی اور اس آگ میں پہلے سائیکل پھر گھڑی جل گئی تو میری ہمت گلابوں کی طرف دیکھنے کی نہیں ہوتی۔ یہ گلاب اتنے دہک کیوں رہے ہیں، لپٹیں کیسی اٹھ رہی ہیں، اتنی سُرخی کہاں سے آ گئی۔ ان کا اور آشی کے گالوں کا مقابلہ ہی کیا۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے گلابوں سے ہٹ کر آشی کے گالوں پر نظر پڑ جاتی تو مجھے مُرجھائے ہوئے پھولوں کا خیال آتا اور میرا دل چاہتا میں آئینہ کہیں دور پھینک آؤں۔ کہیں آشی

تنہائی میں موازنہ کرنے نہ بیٹھ جائے۔

پھر ماں کی آنکھوں میں خیمہ زن بدلیاں پگھل گئیں۔ مجھے پٹنہ کے سیلاب کا خیال آتا جہاں لوگ مکانوں کی چھتوں پہ پناہ گزیں تھے مگر میرا گھر تو مٹی اور کھپریل کا ہے۔ گلاب کے پودے سیلاب میں سڑ گئے، جوہی کی لتیں ٹوٹ کر بکھر گئیں، بیلے نے خودکشی کر لی اور آشی گردن تک سیلاب میں ڈوبی ہوئی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

اور میرا دل فلسطین کی دھرتی بن گیا۔ میں بمباری کے خوف سے اندر ہی اندر سمٹتا جا رہا تھا اور میرے چاروں طرف آگ، گرد اور تپش، زخموں سے رستا ہوا خون، درد، ٹیس اور جلن، راتوں کو آنکھیں بند کر کے بظاہر سو جاتا مگر جاگتا رہتا کہ کہیں بمباری بچی کھچی دھرتی کا بھی چیتھڑا نہ اڑا دے۔ تھکی ماندی آشی میرے گلے میں باہیں ڈالے سوتی رہتی۔ میں آنکھ بند کئے جاگتا رہتا۔ وہ آنکھیں کھولے سوتی رہتی۔

آنے والا کل ..... پرسوں ..... ترسوں، پورے چھ ماہ کا بن باس۔

اور عید کو صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔

میں کالج ختم کر کے گھر نہیں گیا۔ یہ پہلی عید ہے جو آشی میرے گھر کر رہی ہے۔ لوگ آئیں گے، رشتہ دار آئیں گے۔ ایک پروفیسر کی بیوی پرانی ساڑی پہنے ہوئے یہ پہلی عید اور محرم کی طرح خوشی کے دن آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو، جھکی اور پشیمان نظریں، کمرے میں مقید جسم اور چلتی پھرتی پرچھائیں۔ شادی سے پہلے دیکھے ہوئے عید کے دن کے مشترک خواب، میں اس سے کیا کہوں گا، کیسے کہوں گا، کس طرح اس کی پیشانی چوم کر عید کی مبارک باد دوں گا، کس بات کی مبارک باد؟

اُس کی بربادی کی، خوابوں کی تباہی کی، تمنّاؤں کے خون کی! ماں کی دوا.....
پیٹ کا دوزخ، بجلی کا بل، بھائی کی فیس، عید کے کپڑے اور سیونگ اکاؤنٹ
میں پانچ کا ایک ہندسہ......

جب ہمارے یہاں منّا ہو گا تو..... ہر عورت پہلے بیوی بننا چاہتی ہے پھر
ماں..... میں مکمل ہونا چاہتی ہوں..... شادی کو پانچ ماہ ہو گئے اور ابھی تک
......جب ہمارے یہاں منّا ہو گا تو..... جب منّا.....

میرے قدم فیملی پلاننگ منسٹر کے دروازے پر رُک گئے ہیں۔

ڈاکٹر میرے ایک بچہ ہے اور میں.....

اُس رات مجھے تیز بخار رہا۔ شانے کی دوزخ پورے بدن میں پھیل گئی تھی مگر
ہسپتال سے باہر نکلتے ہی مجھے موسم کی خوشگواری کا احساس ہوا، آسمان پر بادلوں کے
ٹکڑے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے، دور ٹیلے پر سورج پگھل پگھل کر بہہ رہا تھا۔
ہوا میں خنکی تو نہیں تھی مگر مجھے اپنے شانوں کی دوزخیں ٹھنڈی ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔
میری داہنی جیب میں رکھے ہوئے نوٹ مجھ سے دوکان کی طرف چلنے کو کہہ رہے تھے۔
شوکیس میں سجی ہوئی مٹھائیاں، لہراتے ہوئے رنگین آنچل، میڈیکل اسٹور، دوکانوں
پر سوئیاں، لچھے، عید کارڈ اور خوشبوئیں۔

دوکانوں پر کتنی بھیڑ ہے اور مجھے کتنی چیزیں خریدنی ہیں، دوائیں، ساڑیاں،
اور نہ جانے کیا کیا۔ آشی گردن تک سیلاب میں ڈوبی ہوئی، تھکی تھکی سی جد و جہد کرتی
ہوئی میری راہ دیکھ رہی ہو گی۔ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں کے نچے ہوئے گلاب مسکرانے
کی کوشش کریں گے۔ مگر میں اُسے سیلاب سے نہیں نکالتا۔ میرے بازو، میرا سینہ، میرا

دل مسلسل بمباری سے لہو لہان ہے۔ زخموں میں درد اور ٹیس ہے، انگلیوں کے پوروں سے خون ٹپک رہا ہے۔ اس لئے میں اُس کا ہاتھ تھام کر سہارا نہیں دیتا کہ وہ پوروں سے ٹپکتا ہوا خون دیکھ کر ہمت ہار دے گی۔ میں اُس سے آنکھیں نہیں ملاتا کہ مجھے ڈر ہے، وہ سوال کریں گی، ہمارے وہ گلاب کیا ہوئے؟ جوہی، بیلا اور مالتی کے پودے، لتیں، شاخیں اور پھول سب کہاں چلے گئے، خواب پتھر پر گرے، کانچ کے برتن کی طرح چکنا چور کیوں ہو گئے؟ تمھارے سہارے تو میں نے ہر بلندیاں سر کرنے کا عہد تھا مگر آج میں سیلاب میں گھری ہوئی ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں، میرے پاؤں کیچڑ میں دفن ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ایک دن اسی طرح اپنے گلابوں کی لاش اپنے کاندھے پر لئے کیچڑ میں دفن ہو جاؤں گی۔ تم کب آؤ گے، کب وعدے پورے کرو گے؟

شام کچھ اور گہری ہو گئی تھی، دکانوں پر قمقمے جگمگانے لگے، میں نے دو معمولی ساڑیاں خریدیں، دوا خریدی، رکشہ والے کو میں نے رکشہ دھیرے چلانے کی تاکید کی تھی۔ میری نظریں رکشہ والے کی پسینے میں بھیگی ہوئی پیٹھ پر جمی ہوئی تھی جو دھیرے دھیرے کوئی فلمی گیت گنگنا رہا تھا۔

تم روز کتنا کما لیتے ہو؟

رکشا والے نے گردن گھما کر حیرت سے مجھے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی مگر میرے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر دھیرے سے بولا "یہی کوئی آٹھ دس روپیہ......" آپ تو کالج میں پڑھاتے ہیں نا" میں آپ کو جانتا ہوں۔

میں اپنے دل میں انگڑائی لیتے ہوئے خیال سے سہم گیا۔ انگلیاں جیب میں بچے ہوئے نوٹوں سے کھیلتی رہیں اور نظروں کے سامنے خود بخود بھٹکتی ہوئی بھیڑ میں جانے پہچانے

چہرے، کلاسز، لکچر اور دوڑ کر پاس آتا ہوا عید کا دن / جا نگھوں میں دھیرے دھیرے اٹھتی ہوئی ٹیسیں، طیاروں کی گڑگڑاہٹ، بمباری کا شور، آگ، دھواں، گرد اور لہو لہان دھرتی، سیلاب میں گڑے ہوئے آشی کے پلنگ، ماں کی آنکھوں سے گرتی ہوئی بجلیاں، طوفان، سیلاب، سیلاب، میں آپ کو پہچانتا ہوں آپ کالج میں......

رکشہ والے رکشہ تیز چلاؤ مجھے جلدی ہے۔

مگر حضور تیز چلنے سے دھچکہ لگے گا اور .....

تیز چلنے سے دھچکا لگ چکا میرے دوست اور یہ دھچکا لہو لہان دھرتی کو ایک سرے سے تک آگ کا غسل دے گیا ہے، آگ سرد ہونے پر بھی تیز بارش ہونے پر بھی، گرد اڑانے پر بھی، گرد اڑنے پر بھی۔ دھرتی کی جلی ہوئی کوکھ سونی کی سونی رہے گی۔ اس دھرتی میں کبھی ہل نہیں چلے گا۔ کیاروں میں قُل قُل کی آواز کرتا ہوا پانی نہیں بہے گا۔ بیجوں سے ننھے ننھے پودے سر نکال کر نیلگوں خلاؤں کو نہیں تاکیں گے، پھل نہیں لگیں گے، پھول نہیں کھلیں گے اور آشی اس جلتے تپتے ریگستان میں حیران و پریشان کھڑی آسمان کی طرف دیکھے گی، میری طرف دیکھے گی اور اُس راستے کو جہاں سے کوئی ننھا منا وجود دوڑ کر آنے والا ہو گا مگر...... دور تک سناٹے میں کوئی آواز نہیں، کوئی سایہ نہیں۔ آگ..... صرف آگ۔

گھر پہنچا تو آشی نے میرے بغل میں دبے ہوئے پیکٹ کی طرف دیکھا، پھر دواؤں کی طرف اُس کی آنکھوں میں چراغوں کی لو جلی مگر جب اُس کی نظریں میرے زرد ہوتے ہوئے چہرے پر پڑیں تو وہ گھبرا گئی۔

کیا ہوا جی، آپ ایسے کیوں ہوئے جا رہے ہیں، اماں دیکھئے تو....

گھبراؤ نہیں، ذرا سا بخار ہو گیا ہے۔

مگر آپ کا ہاتھ تو بالکل سرد ہے۔

بخار اندر ہے۔ ڈاکٹر نے یہی بتایا ہے، تم نہیں سمجھو گی۔

میں اُس کے مزید سوالوں سے بچنے کے لئے آنکھیں بند کئے لیٹا رہا، جب وہ اپنا کام ختم کر کے واپس آئی تو اندر کی آگ باہر پھیل گئی تھی اور میں تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ اُس رات میری آنکھیں جب بھی کھُلیں، وہ جاگتی ہوئی، میرا سر دباتی ہوئی، میرے چہرے کو چومتی ہوئی ملی۔ میں نے کئی بار اُسے سو جانے کو کہا مگر اُس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے چپ رہ جانا پڑا۔

آپ کے پاس پیسے نہیں تھے تو پھر یہ کپڑے، دوائیں اور ....

ایک دوست نے قرض لوٹایا ہے۔

مگر میرے پاس تو .....

میں اور تو سارے دکھ خوشی سے جھیل سکتا ہوں، مگر آشی کے چہرے کی شکن، آنکھوں کی پشیمانی سہن نہ کر سکوں گا۔ میں نے اُس کی پیشانی چوم لی اور وہ سحر زدہ سی میری باہوں میں پڑی سرگوشیاں کرتی رہی۔

تین دنوں تک مجھے گھر میں پڑے رہنا تھا۔ تمام دن گھر میں بچوں کا شور، ارشی، فیضی، شابی اور بوبی۔ آنٹی میری گڑیا، آنٹی میرے کھلونے، آنٹی ٹافی، آنٹی طوطے مینے والی کہانی۔ آنٹی آنٹی۔

میں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، مگر آوازیں ہزاروں لاکھوں ذروں میں بٹ کر مساموں سے میرے جسم میں سرایت کر رہی تھیں اور ایک کے بعد ایک کھُلتے دریچوں سے

بچے سنکل نکل کر ضد کر رہے تھے۔ آنٹی گڑیا، کھلونے ٹافی اور کہانی۔

سیلاب کا زور کم ہوگیا تھا، بمبار طیارے واپس جا چکے تھے، آشی کے چہرے کے گلاب دہکنے لگے تھے، میرے شانوں کی سلگتی ہوئی دوزخیں کچھ ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ مگر دونوں جانگھوں میں ٹیس اُٹھ رہی تھی اور رگوں میں دوڑتے ہوئے ناگ دماغ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

آشی کو بچوں کا بہت شوق ہے اور میں نے اپنی مملکت کی حفاظت ایک سال تک کرنے کا عہد کیا تھا مگر اب آشی سے کیا کہوں گا، کیسے کہوں گا کہ میں نے اپنی مملکت فروخت کردی اور اب ساری زندگی اسی گھر میں، اسی آنگن میں پڑوس کے بچوں کے درمیان بوڑھی آنٹی کہانیاں سنایے گی، گڑیوں کا بیاہ رچایے گی، ٹافیاں اور کھلونے تقسیم کرے گی اور جب وہ کسی بچے کو اپنے سینے سے بھینچے گی تو اس کے دل میں ہوک اُٹھے گی۔ اس کی پیاسی چھاتیاں کسی کے نرم وگرم ہونٹوں کی منتظر چھاتیاں، چیسر چیسر کی آواز سننے کے منتظر کان اور وہ سلگتی ہوئی نظروں سے دیکھے گی تو میں......

میں نے خود کو کہانیوں میں گم کرلیا۔ باتیں کرنے کا کم سے کم موقع۔ کم سے کم وقت۔ اپنے اندر کے چور سے ڈرا ہوا، سہما ہوا، اگر اس نے اپنی تمنا کا اظہار کیا، بچوں کی باتیں کیں تو ؟ میرے چھوٹے بہانوں میں پڑی ہوئی دراڑیں صاف نظر آجائیں گی، مگر میں اس طرح کب تک صلیب پر لٹکتا رہوں گا، کب تک مصروفیت کا بہانہ کروں گا، کاغذ کی ناؤ کتنی دور چلے گی اور تب...... کہیں وہ مجھے....؟

پرنسپل صاحب نے کالج کی ترقی کے لئے میری لگن، میرے کام دیکھے تو ایک

ماہ کی تنخواہ دیتے ہوئے بولے۔ آپ کے (DONATION) کی میعاد تیسرے ماہ سے ختم کی جا رہی ہے۔ اب آپ کو ہر مہینہ تنخواہ ملے گی۔

آشی تو جیسے پاگل ہو گئی۔ ماں کی آنکھوں کی بدلیاں بھی چھٹ گئیں اور پورے آنگن میں دھوپ پھیل گئی۔ آشی فرصت کے لمحات میں ملبوں کے نیچے دبی ہوئی گلاب، بیلے اور جوہی کی جڑیں ڈھونڈتی رہتی۔

کچھ نہیں بچا، سب سڑ گل گیا۔ ہمیں پھر سے درخت لگانے ہوں گے۔ مٹی ملائم کرنی ہو گی۔

میں مجرم بنا اُس کی مشغولیت دیکھتا رہا، اندر ہی اندر سُلگتا رہا۔ جیسے کوئی دیا بند کمرے میں جلتا ہو اور باہر اندھیرے میں پانی برستا ہو۔ اس نے بھی مجھ سے کچھ کرنے کو نہیں کہا۔ جو کچھ کر کے آتی مجھے دکھاتی، بتاتی، مشورہ طلب کرتی اور میں خموش نگاہوں سے دیکھتا رہ جاتا۔ وہ بڑے اعتماد سے کہتی، ہمارے سارے خواب پورے ہوں گے۔ اب تنخواہ ملے گی تو میں کچھ روپیہ پس انداز کروں گی تب آپ اسکوٹر لے سکیں گے۔ مگر آپ اتنے چپ چپ سے کیوں رہنے لگے ہیں، پریشان پریشان۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا اب پچھتا رہے ہیں کہ میں نے ایسی سر پھری لڑکی سے شا.....

میں نے اپنے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹ بند کر دیے۔ تمھیں میری محبت میں کمی معلوم ہوئی کیا؟

اور میں نے اپنی محبت اپنے وجود کے ہونے کا یقین دلانے کے لئے اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کا سایہ قائم کر دیا۔ اُسے اس کی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کسی تمنا کا اظہار کرے۔ رات گئے دیر تک گہری گہری سانسوں کے درمیان میں اور وہ اُن راستوں

پر چلتے رہے جواب انجانے نہیں رہے تھے جن کے ایک ایک لمس، ایک ایک اسرار، پستی و بلندی، نرمی و سختی اور حدّتوں سے ہم آشنا ہو چکے تھے۔ پھر بھی بڑی لذت تھی، بڑی راحت تھی، جانی پہچانی وادی میں آبشار کا شور، ہوا کی گنگناہٹ، پھولوں کی مہک، شبنم کی آنچ اور ہم دونوں مسرتوں کے حصول کے لئے آگے اور آگے کی طرف، تب ٹھوکر لگتی، ہم گرتے گرتے سنبھلتے۔ آنکھیں کھول کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور وہ تھکی تھکی سی آواز میں بند ہوتی آنکھوں کے درمیان سرگوشی کرتی، آپ تو دیوانے ہو گئے ہیں کہیں کوئی ایسے بھی......

وہ سوجاتی اور میں صلیب پر سے اتر آتا۔ ایک دن اور بیت گیا، ایک جگ اور بیت گیا۔ رات ڈھلے گی، صبح ہو گی، دن ڈھلے گا، شام ہو گی پھر رات اپنی زلفیں بکھرا دے گی اور میں اپنے اندر سے نچوڑ نچوڑ کر قطرہ قطرہ حرارت جمع کروں گا اور اسے مشین کے تیل کی طرح استعمال کروں گا، صلیب پر ٹنگی ہوئی ایک رات کے لئے اور پھر اس طرح کی بے شمار راتیں...... لمس پتھراتے جا رہے ہیں، پھولوں کی خوشبوئیں اُڑتی جا رہی ہیں، آبشار کا بے ہنگم شور، ہوا کی گنگناہٹ، ذہن میں ڈنک مارنے لگی ہے۔ اس پتھراتے ہوئے لمس کو قوت ارادی کی گرمی کب تک متحرک رکھ سکے گی؟ ایک دن حرارت کا آخری قطرہ بھی خشک ہو جائے گا اور تب...... ذہن میں پڑی ہوئی لکیریں کشادہ دراڑ بن کر آشی سے کہہ دیں گی کہ سیلاب میں گلاب، جوہی، چنبیلی کی جڑیں ہی نہیں سڑیں، تمھاری تمناؤں کے چمن میں بھی آگ لگ گئی تھی اور اب وہاں جلتی ہوئی دھرتی میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں کہ پیاسے کے ہونٹوں پر امرت بنے۔ تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو، بھاگتی رہو گی

اور ایک دن تمھارے چہرے پر لاتعداد جھریاں ہوں گی اور جھریوں میں ریت کے ذرّے۔ تمھارے بال چاندی ہو جائیں گے اور تم پیاس کا صحرا بھی کاندھوں پر سوار آرام گاہ کی طرف لے جائی جاؤں گی۔ آخری آرام گاہ کی طرف۔

مگر آشی نے عید کے بعد پھر کبھی اپنے مکمل ہونے کی بات نہیں کی، مٹنے کی باتیں نہیں کیں اور ایک مہینہ گذرتے گذرتے اس نے مجھ سے پھر کترانا شروع کر دیا۔ میں اُسے خوابوں کے جزیرے پر سفر کی دعوت دیتا، ساز پر موسیقار کی بے چین انگلیاں متحرک ہوتیں مگر کہیں کوئی لہر نہ اٹھتی، کوئی احساس نہ جاگتا۔ وہ میری کہانیوں کی، آنگن میں لگے پودوں کی، کالج کی، اسکوٹر کی اور دنیا جہان کی غیر متعلق باتیں شروع کر دیتی۔ میں لکھتا رہتا، پڑھتا رہتا اور وہ بستر پر کہنی کے بل اوندھی لیٹی ہوئی ایک ٹک مجھے دیکھتی رہتی۔ تب میرے جسم میں دوڑتے ہوئے ناگ نوچ نوچ کر میرا مغز کھانے لگتے۔ کیا آشی نے میری جانگھوں پر کھلے گلاب دیکھ لئے، میں نے تو پردہ پوشی کی پوری کوشش کی تھی۔ سفر ہمیشہ اندھیرے میں شروع اور ختم ہوا۔ تہمد کی جگہ سلیپنگ ٹراؤزر نے لے لی تھی، پھر کب، کہاں اور کیسے یہ کچھ ہوا۔ پوچھنے پر وہ کچھ نہیں کہتی اور میں بے چین رہتا کہ کیسے اُس کے خیالات میرے ذہن میں ٹرانسمٹ ہو جائیں چاہے وہ کتنے ہی بُرے کیوں نہ ہوں۔ گالیاں، طعنے جو کچھ بھی ہو، جوالا مکھی پھٹ تو پڑے۔ چاہے سب کچھ جھلس جائے، سب فنا ہو جائے، مگر یہ دوریاں، یہ فاصلے، کھویا کھویا پن، اُلجھی اُلجھی نظریں، یہ بے چینیاں کسی ساحل سے تو ہم کنار ہوں۔

اور اُس رات حملہ آور طیاروں نے پھر فلسطین کی دھرتی پر بمباری کی۔

جب آشی نے اپنے بکس سے ڈھیر سارے کپڑے نکالے، چھوٹے چھوٹے کپڑے، سُرخ اونی سوئٹر، ٹوپی، جرابیں، چڈیاں فراکیں اور قمیضیں ۔۔۔۔

آگ لگا دو اِن میں، جلا دو اِن کپڑوں کو، بھر لو گرم راکھ اپنی مانگ میں کہ اس گھر میں ان کو پہننے والا کبھی نہیں آئے گا۔ میں چیخ رہا تھا۔ میں نے عید کے دن کے لئے اپنی مملکت ڈیڑھ سو روپیوں میں فروخت کر دی ہے۔ اب یہ گھر ہمیشہ سونا رہے گا، اب تمھاری گود ہمیشہ خالی رہے گی، تمھاری چھاتیاں دودھ سے کبھی نہیں چھلکیں گی، تمھارے ہونٹ لوریاں نہ گائیں گے، اس گھر میں کسی بچے کے رونے کی آوازیں نہیں گونجیں گی، میں نے تمھاری تمناؤں کا خون کر دیا ہے، میں خونی ہوں میں ۔۔۔۔ میں نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لئے۔

آشی روتے روتے ہنس پڑی، دیر تک ہنستی رہی۔ پھر کپڑوں کو سینے سے لگا کر سسک سسک کر رونے لگی۔

اور دوسرے دن اخبار میں حادثے کی ایک خبر شائع ہوئی تھی۔

شارق ادیب

ایک منٹ اور

جنوری کے آخری ہفتہ کی سرد رات ——

حضرت نظام الدین کا بس اسٹاپ۔ اس نے بند گلے کے کوٹ کے تمام بٹن لگاکر، اونی ٹوپی کو سر پر اچھی طرح منڈھ لیا۔ جیب سے رومال نکال کر عینک کے شیشے صاف کیے۔ اسے دوبارہ ناک پر جمایا اور ایک نگاہ اپنے پورے جسم پر ڈالی، دن میں کئی بار بس سے سفر کرنے اور بھیڑ میں چڑھنے اترنے کے بعد بھی اپنے آپ کو صحیح سلامت دیکھ کر اطمینان کا لمبا سانس کھینچا۔ دستانے میں محفوظ دائیں ہاتھ سے بیگ سنبھالا اور بایاں ہاتھ جیب سے نکال کر کلائی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر تین منٹ ہوئے تھے، گریٹر کیلاش جانے والی آخری بس آنے ہی والی تھی، جامع مسجد سے نو بج کر چالیس منٹ پر روانہ ہونے والی ۱۴۱ نمبر کی بس عام طور پر دس بج کر پانچ منٹ تک یہاں آجاتی تھی۔

رات کی چادر ہر لحظہ گفت ہوتی جارہی تھی۔ مرکری روشنیاں سردی سے

ٹھٹھر کر مریل ہو چلی تھیں، سڑک پر دور نشیب میں، باغ خسرو کے قریب، عرب کی سرائے کا چکر کاٹتی ہوئی، متعدد ہیڈ لائٹس تاریکی کا سینہ چیرتی بڑھی چلی آرہی تھیں ——— اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ دس بج کر چار منٹ ہو گئے تھے۔ آگے پیچھے دو بسیں آکر رکیں، پچھلی بس کی پیشانی پر انگریزی ہندسوں میں ۱۱۴ اور ہندی میں گریٹر کیلاش کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔ بس اسٹاپ پر خود اکیلا محسوس کر کے اس نے جلدی سے قدم بڑھائے۔ بائیں ہاتھ سے ہینڈل تھام کر فٹ بورڈ پر قدم جمائے ہی تھے کہ کنڈکٹر کی سیٹی اور بس کا انجن دونوں ایک ساتھ جاگ اٹھے۔ بس جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے ریزگاری کی تلاش میں جیب میں ہاتھ دوڑایا۔ انگلیاں کسی چیز سے ٹکرائیں۔ اسے خیال آگیا جیب میں ثریا کی گھڑی تھی۔ جو اس نے دو دن قبل اسے ٹھیک کرانے کو دی تھی۔ لیکن وہ اپنے دفتر کی سیڑھیاں اتر کر، سڑک پار کر کے اپنے شناسا گھڑی ساز کے پاس نہ جا سکا تھا۔ ا بکل جمعرات ہے۔ اُدھر کا بازار بند رہے گا۔ اس کا مطلب یہ کہ گھڑی پرسوں سے پہلے ٹھیک ہونے کے لیے نہیں جا سکتی۔ ہونہہ۔ اس نے جیسے گھڑی کے خیال کو نہیں بلکہ گھڑی کو ہی جیب میں جھٹک دیا۔ دس دس کے تین سکے تلاش کر کے نکالے اور کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیئے۔ کنڈکٹر نے استفہامیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کے اوپر پھر جھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ تیس پیسے میں یہ بس اپنی آخری منزل تک جائے گی۔ اور اس سے کم کا ٹکٹ نہیں ملتا۔ پھر پوچھنے کی بھی کیا ضرورت ہے، کہیں کا بھی ٹکٹ دیا جا سکتا ہے۔ وہ احتجاجاً خاموش رہا۔ کنڈکٹر نے بے خیالی میں یا اس کے سکوت سے نالاں ہو کر ٹکٹ دو جگہ سے پھاڑا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

اوپر کا راڈ تھامے ہوئے، بس کے جھٹکوں کو شمار کرتا وہ آگے بڑھ آیا۔

بس تقریباً خالی تھی۔ سردی نے سب کو گھروں میں قید کر دیا تھا لیکن اسے تو دو دفتروں میں کام کرنے کے بعد اسی وقت لوٹنا ہوتا تھا۔ ساڑھے نو بجے مغربی نظام الدین میں اپنے دفتر سے چل کر پندرہ منٹ میں بس اسٹاپ تک آتا تھا۔ اور آخری بس پکڑ کر مول چند پہنچتا تھا اور پھر پندرہ منٹ پیدل چل کر کرے کے اس گھر کی سیڑھیاں چڑھتا تھا۔ جسے اس کی مالکہ، مکان فلیٹ کہتی تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ وہ رات کو صرف اس لیے گھر آتا ہے کہ صبح پھر گھر جانا ہے۔ بس ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ وہ اپنے جسم کا توازن کھو بیٹھا اور ایک سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔ کنڈکٹر نے آواز لگائی ——— "آشرم" ——— نہ کوئی سواری اتری اور نہ چڑھی۔ بس غرا کر آگے بڑھ گئی۔ ہینگنگ برج کے نیچے سے گزر کر بس چوراہے پر زاویہ قائمہ پر گھومی اور، اوور برج پر چڑھنے لگی۔ ایک شخص اٹھ کر اگلے دروازے پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور نے پیروں کا دباؤ بڑھایا۔ غراہٹ پھر گونجی، لیکن ڈرائیور نے انجن بند کر دیا اور بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اعلان کیا کہ "کلچ" کا تار ٹوٹ گیا ہے۔" ڈرائیور نے انجن بند کر دیا اور بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اعلان کیا کہ "کلچ کا تار ٹوٹ گیا ہے"۔ مسافر بڑبڑانے لگے۔ "ٹھیک کرو پنڈت جی" دور افتادہ کونے سے کنڈکٹر کی شریر آواز ابھری۔ اس نے بے بسی سے گھڑی کا سہارا لیا۔ سوا دس بجے تھے اب کیا ہوگا۔ نہ جانے یہاں کتنی دیر لگے۔ اب تو کوئی اور بس بھی نہیں آئے گی۔ اسے تو ابھی مول چند کے چوراہے سے ناشتے کے لئے انڈے خریدنے تھے۔ اس کے بعد گیتا مارکیٹ سے گزرتے ہوئے دودھ کی بوتل لینی تھی۔ انڈے والا دوکان بڑھا ہی

رہا ہوگا اور ٹافی والی دوکان ٹھیک ساڑھے دس بجے بند ہو جاتی ہے۔ روزانہ آخری گاہک وہی ہوتا ہے۔ اب اگر بس کو یہاں دس منٹ بھی لگ گئے تو اس کا سارا پروگرام درہم برہم ہو جائے گا۔ جب وہ بس اسٹاپ پر اُترے گا تو انڈے والا جا چکا ہوگا، دودھ اور ٹافی کی دُکانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ مکان کی مالکہ بھی پونے گیارہ بجے کی سیٹی کے ساتھ ہی باہر کے گیٹ میں تالا ڈال دیتی ہے۔ پھر گھنٹوں چیخنا پڑتا ہے تب جاکر بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے۔ سابقہ کرایہ داروں کے شریفانہ اطوار یاد کرکے اور اس کی بے قاعدگی پر شرمندہ کرکے گیٹ کھولتی ہے۔

——— انڈے نہیں ملیں گے تو ثریا علی الصبح اٹھ کر سبزی بنائے گی۔ ننھی حنا کو صبح ہی صبح سرہانے ٹافیاں رکھی نہیں ملیں گی تو اُس کا مُنہ پھول جائے گا اور اپنے توتلے مُنہ سے کہے گی کہ "ہم ابی سے نہیں بولتے۔" دن اور رات میں صبح کا ہی نصف گھنٹہ تو ہوتا ہے جسے وہ اپنی پیاری بیٹی کے ساتھ گزارتا ہے، اس میں بھی وہ روٹھی رہے گی۔ پھر صبح چھ بجے اٹھ کر دہلی مِلک اسکیم کے ڈپو کی لائن میں لگنا پڑے گا ورنہ دودھ کہاں سے آئے گا۔ دودھ آنے میں دیر ہوگی تو ناشتہ دیر میں ملے گا۔ جلدی کی وجہ سے شیو کا پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا۔ پھر بھی گھر سے نکلتے نکلتے اسے دیر ہو جائے گی اور جب تک وہ رِنگ روڈ کے بس اسٹاپ پر آئے گا تو بس کی قطار طویل ہو چکی ہوگی۔ اِن سب باتوں کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے دفتر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ اور دفتر جاکر باس کی تیز نظروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ باس جو اپنے بُرے دنوں کی سب عادتیں بھلا بیٹھا ہے مگر وقت پر آفس آنے کی عادت نہیں بدل سکا۔

کھٹ کھٹ کی آواز نے اس کی سوچ کو تار تار کر دیا۔ ڈرائیور نے بونٹ اٹھا دیا

تھا اور شاید تار لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگلے ہی منٹ گاڑی کا انجن بیدار ہو گیا۔ اس نے پھر گھڑی دیکھی۔ دس بج کر اکیس منٹ ہوئے تھے۔ گویا صرف چھ منٹ گزرے تھے۔ لیکن یہ چھ منٹ کتنے طولانی تھے۔ یہ چھ منٹ اس کے پورے پروگرام کا شیرازہ منتشر کرنے کی بھرپور قوت رکھتے تھے۔

ڈرائیور نے بس کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں اور بس بھاگی جا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ بسیں دہلی کی زندگی کی کتنی سچی علامت ہیں۔ تیز رفتار اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سب کو پیچھے چھوڑنے کی کوشش میں دوڑتی بھاگتی۔

سارے بس اسٹاپس ایک شانِ بے نیازانہ کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیور نے ہول چند اسپتال کے سامنے بریک دبائے۔

وہ لپک کر اُترا۔ لیمپ پوسٹ کے نیچے آ کر گھڑی دیکھی، دس بج کر اکتیس منٹ ہوئے تھے یعنی وہ صرف ایک منٹ لیٹ ہوا تھا۔ ضائع ہو جانے والے صرف چھ منٹ میں سے پانچ منٹ ڈرائیور نے اپنی تیز رفتاری کے ذریعہ بھاگتے ہوئے وقت سے واپس وصول کر لیے تھے۔ لیکن ان چھ لمحوں کے ہاتھ کے نکل جانے کے خوف سے اس پر کتنے عالم گزر گئے تھے۔

اس نے تیز تیز قدم بڑھا دیے۔ ابھی ایک منٹ کا حساب برابر کرنا تھا۔

●●

سیّد محمّد اشرف

سورج کے چکّر

نیم اور ببول کے درختوں پر مشتمل یہ میدان پندرہ بیس کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ پہلے یہ زمین اوسر تھی۔ اوسر اس زمین کو کہتے ہیں جو کاشت کے قابل نہیں ہوتی۔ لیکن اطراف میں بسے ہوئے چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے کسانوں نے قدرتی پانی کے سہارے بہت سی زمین کاشت کے قابل بنائی ہے۔ اور اب وہ ایکھ اور ارہر بو لیتے ہیں۔ کسی وجہ سے پندرہ بیس میل کا ٹکڑا کھیتی کے لائق نہ بن سکا جو اب بھی اوسر کا میدان کہلاتا ہے۔ قدرتی طور پر اُگے نیم اور ببول کے لاتعداد درختوں نے حالانکہ اس زمین سے بنجرپن کا داغ مٹا دیا ہے لیکن اب بھی یہ میدان اوسر کے میدان کے نام سے ہی جانا جاتا ہے۔ اسی میدان کے کنارے کنارے ہوتی ہوئی ایک نہر بھی گذرتی ہے لیکن سطح زمین سے نیچی ہونے کی وجہ سے سینچائی کے لئے قطعاً غیر مفید ہے۔ البتہ اس نہر سے جب سے ایک بمبا نکال لیا گیا ہے قدرت کا احسان کسانوں پر کم ہو گیا ہے اور اب ان کی نگاہیں

آسمان پر بادلوں کی بجائے نہر اور بمبے کی مشترکہ پلیہ پر لگی رہتی ہے کہ کب پلیہ کھلے اور کب سینچائی شروع ہو۔ اس بمبے کا فائدہ اٹھا کر کسان ادھر اوکھ کے علاوہ گیہوں اور چنے اور مکئی کی فصل بھی اگانے لگے ہیں۔

ادھر کا یہ میدان دو چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ ایک تو ریہہ جو دھوبیوں کے کپڑے دھونے میں کام آنے والی بھد میلی سی مٹی ہوتی ہے اور دوسرے کالے ہرن جو اپنے لمبے نکیلے سینگ اور ماداؤں کو لیے کھیتوں کھیتوں چرتے پھرتے ہیں اور کھا پی کر ببولوں کے چھدرے سائے میں غول کے غول بنا کر بیٹھے جگالی کیا کرتے ہیں۔

سورج ابھی نہر کے پانیوں میں غوطہ لگائے ہوئے تھا۔ صبح کی سفیدی آسمان کے کنارے پھیل چکی تھی۔ گہرے رنگ کے آسمان کے کنارے یہ سفیدی ایسی لگ رہی تھی جیسے ادھر کے جوان ہرے بھرے کھیتوں کے چاروں طرف کھنچی ہوئی چکنی منڈیریں۔

ہرنوں کا غول بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔ اکّا دکّا ہرن کھڑے تھے۔ بچّے کلیلیں کر رہے تھے اور کچھ مادائیں چوکنّا نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہوا زور سے چلتی تو اوکھ کے کھیتوں میں سرسراہٹ ہوتی اور ہرنیاں تڑپ کر کنوتیاں بدل بدل کر کان ہلا ہلا کر اوکھ کے کھیتوں کی طرف آنکھیں گاڑ دیتیں اور بہت دیر تک بت بنی ادھر ادھر دیکھتی رہتیں۔ جب تک کسی اور طرف سے کسی اور طرح کی آواز نہ سنائی دے جاتی۔

بوڑھا سردار ببول کے بڑے درخت کے چھدرے سائے میں بیٹھا کچھ سوچ

رہا تھا۔ پھر پرانی مادائیں زمین پر کھر مار مار کر اُسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھیں۔ کبھی کوئی پرانی مادہ اس کے بوڑھے جسم کو سونگھ لیتی جیسے اپنے تحفظ کا یقین چاہتی ہو۔

سردار بہت بوڑھا ہو چلا ہے۔ گہرا سیاہ رنگ اب مٹیالا سا ہو گیا ہے۔ جب اس رنگ پر بہت سی گرمیاں بہت سی سردیاں اور بہت سی برساتیں گزر جاتی ہیں تو بدن ایسا ہی مٹیالا ہو جاتا ہے۔ گھٹنے اور بازوؤں کے جوڑوں پر کالے کالے ڈھٹے پڑ گئے ہیں جو اس کی آرام طلبی کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جسم پر جگہ جگہ چھتوں کے نشانات دیہاتی خنکاریوں کے اناڑی پن کی دلیل ہیں۔ ان کی پشت پر کا سیاہ رونگٹا بالکل جھڑ چکا ہے اور وہاں کی جگہ پر پھنسیوں کے نشانات ہیں جن پر بار بار مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ اور وہ انھیں بار بار دُم ہلا ہلا کر اُڑا دیتا ہے اور مکھیاں پھر بیٹھ جاتی ہیں۔ چھوٹے سے سر پر ایک بل کھایا ہوا سیاہ سینگ جو جگہ جگہ سے چٹخنے لگا ہے اور اس کی چٹخنوں میں دھول جم گئی ہے۔ اور ایک ٹوٹا ہوا آدھا سینگ جو اسے اکثر اس جدوجہد کی یاد دلاتا ہے جو اس نے اپنے پہلے والے سردار کی سرکوبی میں کی تھی۔

وہ واقعہ وہ بھولا نہیں۔ آج بھی اُسے اچھی طرح یاد ہے۔ بچپن ہی سے اُسے اپنے سردار میں بہت سی خامیاں نظر آتی تھیں۔ اس کے زخموں سے اسے گھن آتی تھی۔ سردار کی حکومت اسے پسند نہیں تھی۔ اس کی آرام طلبی سے نفرت تھی۔ اور یہی بغاوت کا جذبہ اس کے دل میں کھولتا رہتا اور وہ اس دن کا انتظار کرتا رہتا جب چمکتی ہوئی کالی چادر سے اس کا جسم مکمل طور سے ڈھک جائے۔

اور ایک دن وہ لمحہ آگیا۔ اس میدان میں جب نیم کے بڑے درخت سے آگ کا
گولہ اوپر سرکا تھا اور ریتیلی مٹی کے ذرے خوب خوب چمک اٹھے تھے اور اسے اپنے جسم
میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوئی تھیں تو اس ببول تلے بیٹھے ہوئے سردار پر
اس نے اپنی جوانی کا پہلا حوصلہ آزمایا تھا۔ پہلے تو بوڑھے سردار نے اُسے
خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہ پایا کہ یہ نوجوان
اس کی سرکوبی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جب غول کے تمام ہرن ایک طرف کو جُھنڈ
بنا کر کھڑے ہو گئے اور اپنی ٹانگیں زمین پر مار مار کر مٹی اُڑا اُڑا کر اس نئے پٹھے
کی حوصلہ افزائی کرنے لگے تو وہ ایک دم تلملا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک اپنے
بوڑھے بدن کے ایک ایک عضو کو ہلا ہلا کر اپنی قوت کا اندازہ کرتا رہا اور پھر
یکبارگی اس جوان پٹھے پر ٹوٹ پڑا۔ بہت دیر تک تیز اور پرانے کی یہ جنگ
چلتی رہی۔ جب سورج بالکل ان کے سروں پر آگیا اور پرچھائیاں ان کے جسموں
کے نیچے چلی آئیں تو ایک دفعہ اس نے سردار کے بوڑھے جسم سے اپنی پوری طاقت
کے ساتھ اپنا جوان بدن لڑا دیا۔ بوڑھا گرا، سنبھلا اور اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے
سینگوں سے اس کا ایک سینگ توڑ دیا۔ اپنے جوان سینگ کا یہ حال دیکھ کر
ایک دفعہ کو جیسے اس کے دماغ میں بھرے لاوے کو جوش آگیا ہو۔ غصہ کے مارے
اس کی آنکھوں میں گدلا گدلا پانی سمٹ آیا ہو اور اس نے اپنے ایک سینگ
سے ہی بوڑھے سردار کی آنتیں کھینچ لیں۔ بوڑھا کچھ دیر وہیں کھڑا جھومتا رہا اور
پھر بڑی تیزی سے مڑ کر پیٹ سے نکلی ہوئی سیاہی مائل خون میں ڈوبی ہوئی
آنتیں مٹی میں لتھیڑتا ہوا دھول اڑاتا ہوا اس نہر کے پانی میں جا کر ہمیشہ کے لئے

ڈوب گیا۔ فضا میں منڈلاتے ہوئے گِدھ ایک دم کلکلا کر چیخنے لگے۔ شور مچاتے ہوئے بہت سے پرندے ان کے سروں پر سے گذر گئے تھے اور وہ خود فتح کے نشے میں چور وہیں بیٹھا بہت دیر تک تھرتھراتا رہا اور پھر ایک دم سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ اپنے غول کا سردار تھا۔ نئی اور پرانی مادائیں اسے چاروں طرف سے گھیرے کھڑی تھیں اور وہیں ایک چھوٹا سا بچہ اپنی معصوم لیکن چمکدار آنکھوں سے کبھی اس پٹھے کے خون میں ڈوبے ہوئے جوان بدن کو دیکھتا اور کبھی اس کی طرف جو بوڑھے سردار کے آخری قدموں سے اڑی تھی اور اب تک فضا میں منڈلا رہی تھی۔

سورج آسمان میں اپنا چکر پورا کر رہا تھا اور آج بوڑھے سردار کو ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ اس بچے کی آنکھوں میں گیہوں کٹ جانے کے بعد والے سورج کی چمک محسوس کر رہا ہے۔ وہی سورج کی چمک جو ہرنوں کے رنگ کو مزید سیاہ کر دیتی ہے۔ وہی چمک جو گیہوں کی ہری بالیوں میں سُنہرا دانہ سجا دیتی ہے۔

اس نے تھکن سے بوجھل آنکھیں اُٹھا کر کالو کو دیکھا۔ سیاہ بالکل سیاہ بدن والا کالو۔ ابھی سورج نیم کے درختوں کے پیچھے ہے۔ جب اوپر آئے گا تو سیاہ رونگٹا اور زیادہ چمک اُٹھے گا۔

اور کالو سب سے پرے کھڑا اپنی اگلی ٹانگیں زمین پر مار رہا ہے۔ آج اس کا دل بے ساختہ چاہ رہا ہے کہ بوڑھے سردار پرانی ماداؤں اور بقیہ ہرنوں سے الگ کھڑی سنہری کے پاس جا کر اپنی زبان سے اُسے چاٹے۔ اُس کی چھوٹی سی تھوتھی

کو سونگھے اور اس کے جسم پر اپنے نکیلے سینگ ہولے سے چھو دے۔ لیکن جب بھی
وہ ارادہ کرتا اسے بوڑھے سردار کی آنکھیں سُرخ نظر آنے لگتیں اور وہ اپنا
ارادہ کچھ دنوں کے لیے ترک کر دیتا۔ بڑی بڑی کالی کالی آنکھوں والی سنہری
اپنے بدن کو کچھ اس انداز سے حرکت دے رہی تھی کہ اس کا دل بے ساختہ چاہا
کہ اس کے پاس چلا ہی جائے۔ آج اس کا دل یہ بھی چاہ رہا تھا کہ بوڑھے سردار
کو سینگ مار مار کر لہو لہان کر دے اور اس کا اکلوتا سینگ بھی توڑ دے۔
اور سنہری کے پاس جا کر اپنا موبنہ سنہری کی تھوتھنی سے رگڑ دے لیکن سردار
کی موجودگی میں یہ سب کرنا بہت دشوار تھا۔ حالانکہ سردار کی عادتوں کی وجہ
سے اُس کی آرام طلبی اور کاہلی سے سبھی ہرن علاوہ پرانی ماداؤں کے اور پرانی
مادائیں بھی شاید اس لیے سردار کی خوشنودی میں لگی رہتی تھیں کہ وہ آڑے
وقت میں ان کے کام آسکے۔ عمر ڈھل جانے کے بعد اور اپنی ذات کو غیر مفید سمجھ لینے
کے بعد اِسی قسم کے تحفظ کا جذبہ ہر جانور کی فطری جبلت ہے۔ لیکن یہ سب کچھ
ہونے کے باوجود بھی سردار کی سرداری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اب بھی
سارے ہرن اسی قیادت میں سارے کام کرتے تھے۔ اسی کی آنکھیں دیکھ کر ادھر
کے کھیت چرتے اور اسی کے حکم سے کبھی کبھی اپنا میدان چھوڑ کر دوسرے میدانوں
میں چلے جاتے۔ کچھ عجیب سا دبدبہ تھا جو ان پر ہمیشہ مسلّط رہتا۔ کچھ تو اس
طاقت کا وہ رعب ان پر سوار رہتا جو اس نے اپنے بوڑھے سردار کی سرکوبی میں
ظاہر کی تھی۔ اور اس کی بزرگی کا ادب۔

لیکن آج کالو بہت مضطرب تھا۔ بچپن کا وہ واقعہ جو اس کے شعور سے

نکل کر لاشعور میں جاگا تھا۔ جب سردار نے اپنے سردار کو ختم کیا تھا اور کالو نے اپنی معصوم نگاہوں سے وہ سارا منظر دیکھا تھا۔ اب تو اسے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس کی چمکتی ہوئی کالی جلد کے نیچے لال لال چمکتا ہوا خون دوڑ رہا ہے۔ اس کے سینگ ہلکا سا بل کھا کر پوری لمبائی تک پہنچ چکے ہیں۔ اور اسے کسی بھی قیمت پر سنہری کو حاصل کرنا ہے۔

ادھر بوڑھے سردار نے سوچتے سوچتے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ نیم کے پرانے درخت کے پیچھے سے آگ کا گولہ اوپر سرک رہا تھا۔ قرب وجوار کی ہر شے کا رنگ آہستہ آہستہ واضح ہو کر اپنے اصلی روپ میں نکھرنے لگا۔ دور کے ادھر اور ایکھ کے کھیتوں میں اب دُھند کی نہیں جمی ہوئی تھیں۔ آج اُسے پورے غول میں عجیب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ ایسی بے کلی تو اس نے کبھی دوسرے غول کے ہرنوں سے لڑنے پر بھی اپنے غول میں نہیں کی تھی۔ سارے ہرن اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ مادائیں کبھی اس کے پاس آتیں اور اسے سونگھتیں اور چونک چونک کر کنوتیاں بدل کر تیزی سے پرے ہٹ جاتیں۔

ہرنوں کے پیروں کے نیچے سے دھول اُڑ رہی تھی۔ سردار کے زخم اب خوب خوب صاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کی رانوں کی پشت پر بیٹھی مکھیاں بار بار اُڑتیں اور بار بار بیٹھ جاتیں۔

سورج کچھ اور چمکا اور بوڑھے سردار نے دیکھا کہ کالو کے جسم کا ایک ایک عضو اپنی جوانی کا ثبوت دے رہا تھا۔ خوب کھنچے ہوئے کالے چمکتے ہوئے سینگ، کھری بھری کمر اور پُر گوشت سینہ اور جسم کے ہر حصہ کی وہ مخصوص تھرکن جو ہرن کا

خاصہ ہے۔ یہ مخصوص تھرکن جب پیدا ہوتی ہے۔ جب ہرن لمبا میدان دوڑنے کے لئے خود کو تیار کرتا ہے یا جب اسے کسی سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ بوڑھا سردار جانتا ہے۔ یہ تھرکن جوان ہرن کی زندگی میں شدت کے ساتھ کب پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے۔ ویسے بھی وہ کچھ دنوں سے اپنے غول میں اس اعتماد کے اٹھ جانے کا احساس کر رہا تھا جو اس نے اپنے سردار کو ختم کرنے کے بعد حاصل کیا تھا۔

سردار نے دیکھا کہ مادائیں بالکل پرے ہٹ کر کھڑی ہو گئی ہیں اور سارے ہرن اس کی اور کالو کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ شروع دن کی دھوپ کی ٹھنڈی چمک سے کالو کا سیاہ رونگٹا خوب چمک آیا تھا اور بل کھائے ہوئے چکنے سینگ بھی خوب چمک اٹھے تھے۔ کالو نے دیکھا کہ دھوپ میں چمک آتے ہی سنہری کا بدن اور صاف ہو گیا ہے اور رانوں کے پچھلے حصہ کا رونگٹا سونے کے تاروں کی مانند چمک رہا ہے۔ اور ادھر بوڑھے سردار کے زخم خوب واضح ہو گئے ہیں اور زخموں پر بیٹھی مکھیوں کی تعداد میں پہلے سے اضافہ ہو گیا ہے۔ اور کالو نے سنہری کی وہ گھٹی گھٹی سی کنواری اور معصوم آواز ابھی ابھی سنی جو ہرنی جوان ہونے کے بعد پہلی بار نکالتی ہے۔ ریت کے ذرے چمکے۔ کالو کے پیروں میں حرکت پیدا ہوئی۔ غول کے تمام ہرنوں نے مٹی پر کھر مار کر اس کی ہمت بڑھائی۔ یکبارگی کالو زمین پر اپنے اگلے کھر مار کر تھوڑا سا نیچا کر کے سینگ تان کر بوڑھے سردار پر جھپٹ پڑا اور نوکیلے سینگ اس کی چھاتی میں گڑو دئے۔ سردار زمین پر ہی ایک دفعہ کو ڈگمگایا، سنبھلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے یہ سمجھنے میں

اتنی دیر بھی نہ لگی جتنی دیر ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں جانے میں لگتی ہے کہ آج کالو کے ہاتھ وہ گھڑی آگئی جو پچھلے وقتوں بوڑھے سردار کو خود اُس کے ہاتھوں دیکھنی پڑی تھی۔ اپنا اکلوتا سینگ لیے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دُم کو زور سے ہلا کر زخموں پر بیٹھی مکھیوں کو اُڑایا۔ بدن کے ایک ایک عضو کو حرکت دے کر طاقت جمع کی اور دفاع کے لئے پوری طرح تیار ہو گیا۔ اتنے میں کالو بھی حملہ کرنے کے لئے پوری طرح سے تیار ہو چکا تھا۔ وہ جھپٹ کر سردار سے بھڑ گیا اور اُسے اپنے نکیلے سینگوں پر رکھ لیا۔ بوڑھا سردار ہر حملہ سوچ سوچ کر روک رہا تھا۔ کالی جلد پر جگہ جگہ خون کے فوارے پھوٹ پڑے جیسے اندھیری راتوں میں ادھر کی رکھوالی کرنے والوں نے جگہ جگہ الاؤ روشن کر رکھے ہوں گے۔ ایک دفعہ کو سردار نے اپنے اکلوتے سینگ سے ہی کالو کا جوان اور مضبوط سینگ توڑ دیا لیکن اس حملے میں اسے اپنا اکلوتا سینگ بھی کھو دینا پڑا۔ اب اس کے سینگ ٹوٹ چکے ہیں اور اسے اپنا سردار یاد آ رہا تھا جو دونوں سینگ تڑوا کر نہر میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو گیا تھا۔ اور ادھر کالو اپنا جوان اور مضبوط سینگ کھو کر دیوانہ سا ہو گیا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سردار کے دونوں سینگ ٹوٹے چکے ہیں تو اسے اپنی فتح کا یقین سا ہو گیا۔ ان دونوں جذبوں نے اس میں ایک نئی طاقت پھونک دی اور وہ بوڑھے سردار پر بُری طرح ٹوٹ پڑا۔

جوان کالو اور بوڑھے سردار کے جسموں سے خون رِستا رہا اور ریتیلی مٹی میں جذب ہوتا رہا۔ سردار آہستہ آہستہ پست ہونے لگا اور کالو کی ہمت بڑھتی رہی۔ سورج بالکل اُن کے سروں پر آگیا تھا اور پرچھائیاں ان کے جسموں کے نیچے موت کا کھیل کھیل رہی تھیں چاروں طرف بلا کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بالکل ساکت تھی اور ایکھ کے کھیتوں کی سرسراہٹ بالکل چپ۔ ہرن پیر مار کر کالو کی ہمت افزائی کرنا بھول گئے تھے اور پرانی مادائیں بوڑھے سردار کے زخموں اور کالو کے حملوں کو بت بنی ایک ٹک دیکھ رہی تھیں۔ کالو نے سنہری کو ایک بار دیکھا اور تڑپ کر بھڑ بھڑا کر اپنا ایک سینگ بوڑھے سردار

بوڑھی چھاتی میں گھونپ دیا۔ خون کا ایک نالا سا بہنے لگا اور سردار ڈگمگایا۔ تو ڈگمگاتا ہی چلا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اب زندگی کی آخری سانسیں لینی ہیں۔ کیا ان ماداؤں کے سامنے دم توڑے جو اس کے جسم کو سونگھ سونگھ کر بچے جنتی تھیں۔ کیا ان ہرنوں کے سامنے اپنی آنکھوں کو پتھرا جانے دے جنھوں نے اس کے ہاتھوں اس کے سردار کی شکست دیکھی تھی۔ کیا مرتے وقت وہ ان ادھر اودھر کے کھیتوں کو دیکھنے کی ہمت کر سکے گا جن میں اس کے بچپن اور جوانی نے سانسیں لیں۔ اور پھر بوڑھا تیزی سے مگر ڈگمگاتے قدموں سے مڑ کر نہر کی طرف بھاگ پڑا۔ خون سے تمام دھرتی سرخ ہو گئی۔ نہر کے پاس پہنچ کر اس نے مڑ کر سب کو اپنی آخری دم توڑتی نگاہوں سے دیکھا۔ کالو فتح کے نشے میں بیٹھا تھر تھرا رہا تھا۔ نئی اور پرانی مادائیں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئی تھیں۔ ہرن دوڑ دوڑ کر رک رہے تھے جیسے کالو کی فتح کا جشن منانے کے لئے رقص کر رہے ہوں۔ کالو اٹھ اٹھ کر سنہری کی جوان تھوتھنی پر اپنا منہ رگڑ رہا تھا۔

سردار نے اپنی اگلی ٹانگیں نہر کے پانی میں ڈال دیں اور اپنا بوڑھا جسم نہر میں ڈھکیل دیا اور آہستہ آہستہ گہرے پانیوں میں غرق ہونے لگا اور اتنے حصہ کا پانی بالکل سرخ ہو گیا۔

اور ادھر کالو سے الگ ماداؤں سے دور سنہری سے پرے ہرنوں کے ادھر ایک چھوٹا سا بچہ اپنی کالی کالی معصوم لیکن چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی بوڑھے سردار کے آہستہ آہستہ غرق ہوتے بوڑھے جسم کو، کبھی خون سے ڈوبے کالو کے جوان بدن کو۔

اور سورج جس کی گرمی سے ہرنوں کی جلد سیاہ پڑتی ہے اور جس کی چمک سے ریت کے ذرے چمکنے لگتے ہیں، آسمان میں اپنا چکر پورا کر رہا تھا۔

"یہ انتخاب......"

اُردو میں نئی کہانی کی بحث اب پرانی ہو چلی ہے لیکن کہانی سے متعلق نت نئے تجربوں کی بنا پر یہ بحث نئی سے نئی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ میں اس پیچیدہ بحث کو یہاں نہیں کریدوں گا۔ محترم ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کے گراں قدر مضمون اور بیس کہانیوں کے مطالعہ کے بعد قاری کو پھر الجھی بحثوں میں پھنسا رکھنا مناسب نہیں ہے۔ بس چند باتیں اس انتخاب کے سلسلے میں ضرور عرض کروں گا۔ کہانی کے سلسلے میں کچھ کہنے اور لکھنے کے ابھی اور بہت سے مواقع ہاتھ آئیں گے۔

یہ انتخاب اُردو کی تین پاکستانی اور سترہ ہندوستانی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ تمام کہانیاں ۷۰ء کے بعد کی وہ کہانیاں ہیں جو ٹیکنک موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے کامیاب کہانیاں سمجھی جا سکتی ہیں۔ ابتدا میں صرف ہندوستان میں لکھی جانے والی کہانیوں کا انتخاب ہی مقصد تھا لیکن ادھر پاکستان کی چند ایسی چونکا دینے والی کہانیاں سامنے آئیں کہ میری نظر انتخاب تڑپنے لگی اور میں نے بے تابانہ تین کہانیوں کو اس انتخاب میں سمیٹ لیا۔ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کے ناخوشگوار ہونے کی وجہ سے دونوں ملکوں کے ادب نواز ادبی رسالوں سے محروم رہتے ہیں اور کس جگہ کیا لکھا جا رہا ہے کم پتہ چل پاتا ہے۔ ہم جیسے نوجوانوں پر یہ مصیبت خاص طور پر نازل ہوتی ہے اور

ہم لوگ اس کڑوی محرومیت کو گلے لگائے صرف دور کے ڈھول سنتے رہتے ہیں اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ادھر جب کچھ حالات سنبھلے، فضا قدرے ہموار ہوئی اور چند افسانہ نگاروں و شاعروں کی انتھک کوششوں سے جب کچھ مواد ہندوستان کے قارئین کی نظر سے گذرا تو کون باذوق ہوگا جس کے دل میں مسرت کے چراغ نہ جل اٹھے ہوں گے۔ کچھ پتہ چلا۔ کچھ جانا گیا۔ انتظار حسین۔ انور سجاد۔ اختر جمال، سائرہ ہاشمی، رشید امجد، سلیم اختر۔ افسر آذر اور خالدہ اصغر کی کہانیاں سامنے آئیں اور میں نے کہانیوں کے اس گچھے سے تین پھول اپنے گلدستۂ انتخاب میں سجا لئے

میں پاکستان کی تین کہانیوں سے زیادہ بھی لے سکتا تھا اور دل بھی چاہ رہا تھا لیکن چند مجبوریاں سامنے آگئیں۔ میرا یہ انتخاب ایک حقیر کاوش ہے، کوئی غیر معمولی کارنامہ نہیں۔ اس انتخاب کی رسائی بھی پاکستان تک ممکن نہیں لہٰذا میں تین کہانیوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ انتخاب کے سلسلے میں جس نسل کو لے کر چل رہا ہوں، انتظار حسین اس نسل میں نہیں آتے، باوجود اس کے کہ وہ اِن دنوں بہتوں سے بہت اچھی و معیاری کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ اختر جمال، سائرہ ہاشمی کی کہانیاں کافی عرصہ قبل نقوش وغیرہ میں شائع ہوئی تھیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ۷۰ء کے بعد اُن کی کوئی کہانی ہندوستان کے کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود ان کی کہانیاں اس انتخاب کی زینت بن سکتی تھیں، لیکن دونوں خواتین کی کہانیوں کی طوالت اور جس کی بنا پر انتخاب کی بڑھتی ہوئی ضخامت کو یہ انتخاب برداشت نہیں کر سکا۔ لہٰذا چند پیچیدگیوں اور مجبوریوں کے تحت ان کی کہانیاں شامل نہ ہو سکیں۔

اس انتخاب کا سب سے بڑا مقصد ۷۰ء کے بعد لکھی جانے والی کہانیوں کے سلسلے میں کامیاب تجربوں کو یکجا کرنا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ کہانی کہاں سے کہاں جا رہی ہے۔ اجتماعی طور پر کہانی کے مطالعہ کے بعد فیصلہ کرنے میں قدرے آسانی ہوتی ہے کم از کم نوجوان

ادیبوں و طالب علموں کے لئے یہ آسانی ضرور ہو جاتی ہے۔ ۷۰ء کے بعد کی شرط ہندوستان کی کہانیوں کے ساتھ ضرور رکھی ہے لیکن پاکستان کی کہانیوں کے ساتھ شرط کی یہ شدت قائم نہ رکھ سکا۔ اقسر آذر کی کہانی "آنے والے لوگ" پہلی بار ہندوستان میں عصری ادب میں شائع ہوئی۔ خالدہ اصغر کی کہانی سواری اور اس کے علاوہ ان کی وہ تمام کہانیاں جو معیار کے پہلے شمارہ میں شائع ہوئیں وہ بقول ڈاکٹر شمیم حنفی کہ کافی عرصہ قبل شائع ہو چکی ہیں اور اب تو خالدہ اصغر اُردو افسانے کے لئے ایک گم ہوتی ہوئی یاد ہیں لیکن ہندوستان کے قارئین کے لئے یہ بالکل نئی کہانیاں تھیں۔ جو ہر اعتبار سے کہانی کے موجودہ سانچے میں ڈھلی نظر آتی ہیں۔ سواری ان میں خاص طور پر ایک چونکا دینے والی کہانی ہے۔ انور سجاد کی کہانی 'کونپل' کی صحیح سن اشاعت سے میں واقف نہیں لیکن یہ اندازہ ہے کہ یہ کہانی ۷۰ء کے ارد گرد شائع ہوئی تھی۔ کہانی کے سلسلہ میں جس طرح کے تجربے ان دنوں ہو رہے ہیں کونپل یقیناً ان میں ایک کامیاب کہانی ہے اور اسی وجہ سے میں انتخاب کی ساری شرطوں کو توڑ کر انور سجاد کے اس شاہکار کو شامل کرنے پر مجبور ہو گیا۔

۷۰ء کے بعد اردو کہانی کاروں کی ایک نئی پود سامنے آئی ہے لیکن بزرگوں کے ذریعہ وہ بری طرح نظر انداز کی گئی۔ یہ سچ ہے کہ تحریر میں اگر دم ہے تو باوجود نظر اندازی و حق تلفی کے نیا ادیب۔ نیا فن کار اپنا مقام بنا ہی لیتا ہے۔ نوجوانوں میں جو نام اُبھر کر آئے ہیں یقیناً انھوں نے اپنا مقام اپنی محنت سے ہی حاصل کیا ہے لیکن۔ بزرگوں کی سرپرستی اور توجہ بھی بڑا کام کرتی ہے۔ ان نئے ناموں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو باوجود اپنے اندر قوت رکھنے کے کچھ اپنی تساہلی، کچھ بزرگوں کی بے توجہی کا شکار ہو گئے اور گمنامی کے غار میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ یہ شکایت نئی نہیں ہے، ایسا ہر دور میں ہوتا آیا ہے۔ بزرگ ادیبوں

اور نقادوں نے اپنے اسٹبلشمنٹ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا ہے خواہ اس سلسلے میں نئے ادیبوں کو نقصان پہنچتا رہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ آج کا نوجوان ادیب جو اس کے خلاف شکایت کرتا ہے کل بزرگ ہو کر وہ خود اسی کا شکار ہو جاتا ہے اور خود نوجوانوں کے سلسلے میں کسی طرح کا نقصان برداشت کرنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔

نوجوان طالب علم کے ناتے انتخاب کے سلسلے میں میرے ذہن میں یہ خاکہ تھا کہ میں صرف نئی نسل کو متعارف کراؤں گا۔ یہ کام ذرا خطرناک تھا لہٰذا میری نظر نئی نسل سے ذرا قبل اس طرف گئی جس کو دیکھنے کے لئے بہت پیچھے نہیں مڑنا پڑتا اور جس نے ۶۰ء کے اردگرد لکھنا شروع کیا تھا لیکن اپنا مقام ۶۰ء کے بعد بنا سکے اور جو آج بھی نوجوانوں کی سرپرستی کرتے ہوئے ان کے کندھے سے کندھا ملا کر عمدہ معیاری کہانیاں لکھ رہے ہیں جن کے اندر نیا جوش و خروش۔ نیا رنگ ہے۔ نئے موضوعات پر سوچنے اور لکھنے کے نئے طرز پر قدرت حاصل ہے ان کو نظر انداز کرنا صرف بے ادبی ہی نہیں بلکہ اپنے خوب صورت سرمایہ اور محبت آمیز سرپرستی سے انکار کرنا ہے۔ لہٰذا میرا انتہائی بداخلاقی کا فعل ہوتا اگر میں اس نسل کے بعض کہانی کاروں کو شامل نہ کر لیتا۔ خالص نئی نسل کا انتخاب بہت جلد منفرد طور پر کروں گا۔

بزرگ کہانی کار جو اس انتخاب میں شامل ہیں ان کا قافلہ آج بھی نوجوان کہانی کاروں کے لشکر میں پیش پیش ہے اور ایک طرح سے سپہ سالاری کا رول ادا کر رہا ہے۔ غیاث احمد گدی۔ قاضی عبدالستار کے ناموں پر ہو سکتا ہے معترضین کے لبوں پر جنبش آجائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے اپنے اعتراض کو استحکام بخش دیں لیکن میں نے اس انتخاب میں پورے طور پر ایمانداری ۔

اور دیانت داری سے کام لینے کی کوشش کی ہے اور اسی بنا پر ان ماہر کہانی کاروں کی قدرت کا خیال رکھتے ہوئے میں ان کی کہانیوں کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ انتخاب کے وقت میرا ذہن قطعی نہ تو کسی قسم کے تعصب کا شکار رہا اور نہ ہی کسی قسم کی گروپ بندی کی طرف مائل تھا۔ اس سلسلے میں میری بساط اور حیثیت ہی کیا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہانیوں کے انتخاب کے سلسلے میں میری ذاتی پسند اور نظریہ کا دخل رہا ہے۔ جس سے بے شک اختلاف کیا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غیاث احمد گدی نے ۱۹۵۰ء کے ارد گرد کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ انھیں کہانی لکھنا ۱۹۶۰ء کے بعد آیا۔ ۱۹۶۹ء میں بابا لوگ کی اشاعت سے قارئین کی نظریں ان کی جانب متوجہ ہوئیں اور وہ غیاث احمد گدی جو آج ہیں ان کہانیوں کے ذریعہ ہوئے جو اس مجموعے کے بعد لکھی گئیں اور اب جو سب کے سب ان کے دوسرے مجموعے "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" میں شامل ہیں۔ تج دو تج دو، ڈوب جانے والا سورج، ایک جھوٹی کہانی، دیمک، اندھے پرندے کا سفر۔ یہ سب وہ معرکہ آرائیاں ہیں جن کو پڑھنے کے بعد کون کافر ہوگا جو ان کی کہانیوں پر ایمان نہ لائے گا۔۔۔۔ پرندہ پکڑنے والی گاڑی اور تج دو تج دو آج دس پندرہ علامتی کہانیوں پر اکیلی بھاری ہیں۔ اب ایسے میں گدی کی شمولیت کیسے ممکن نہ تھی۔

آج کی نئی کہانیاں شہروں میں آکر ڈوب گئی ہیں اور قاضی عبد الستار کی کہانیاں دیہات کے پس منظر سے اُبھرتی ہیں لہٰذا شہر کے بعض افسانہ نگاروں نے قاضی صاحب کے سلسلے میں عجیب و غریب فیصلے کیے۔ قاضی صاحب کا مجموعہ تو بہت بعد میں شائع ہوا لیکن کہانیوں کی دھوم اس سے پہلے مچ چکی تھی۔ قاضی صاحب اپنے مخصوص موضوع اور مخصوص رنگ تحریر کی وجہ سے انفرادی حیثیت حاصل کر چکے

تھے ۔ پیتل کا گھنٹہ ۔ مجو بھیا ۔ رضو باجی ۔ مالکن ۔ بادل ان کی وہ مختصر اور طویل کہانیاں ہیں جو کہانی کے میدان میں اپنی ایک علیحدہ صورت اختیار کر چکی ہیں ۔ ہو سکتا ہے میری ان تحریروں سے اختلاف کی گنجائش پیدا ہو جائے ۔ لیکن مجھے قاضی صاحب کی تحریری عظمت تسلیم کرنے میں ذرا بھی شرم و باک نہیں ہے ۔ ان دنوں قاضی صاحب کا قلم کچھ ڈھیلا پڑ گیا ہے جس کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں ، لیکن اس کے باوجود گزشتہ دو تین برسوں میں کھا کھا ۔ سا ملی ۔ قد آدم مشعل اور دیوالی جیسی خوب صورت کہانیاں سامنے آ چکی ہیں ۔ اگرچہ اس میں وہی رنگ آمیزی ہے جو اس سے قبل ان کی کہانیوں میں ملتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے قلم میں جو طاقت اور دماغ میں کہانی کا جو مواد ہے وہ ان کی کہانی کھا کھا اور سا ملی میں ضرور نظر آ جاتا ہے ۔ باوجود اس کے کہ قاضی صاحب کا فن کہانی کی موجود ٹیکنک سے میل نہیں کھاتا لیکن وہ اپنی مخصوص انفرادیت کی وجہ سے اردو کہانی کی دنیا میں کبھی نہ بھلائے جا سکیں گے ۔ بعض نئے ذہن والے انھیں کہانی کار ماننے میں ہی تامل برتتے ہیں ۔ میں یہاں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جہاں کہانی پریم چند سے روشنی ۔ منٹو سے ٹیکنک اور کرشن چندر سے اسلوب لئے آگے نہیں بڑھ سکتی وہاں قاضی صاحب کی تحریر کا بھی اس پر ضرور اثر پڑے گا کیوں کہ ان کے یہاں کبھی کبھی ان تینوں کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے ۔

جوگندر پال ۔ دورِ حاضر کے ایک شہرت یافتہ کہانی لکھنے والے ہیں ۔ یہ شہرت انھیں نہ تو "لیکن" سے ملی ہے اور نہ مٹی کا ادراک سے اور نہ ہی دوسرے مجموعوں کے ڈھیر سے ۔ یہ جانے گئے صرف بازیافت ۔ کچھوا اور رہائی جیسی کہانیوں سے لیکن

افسوس کہ جوگندر پال کا فن ان چند کہانیوں سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ اس کا مطلب یہ قطعی نہیں ہے کہ جوگندر پال نے اچھی کہانیاں نہیں لکھی ہیں۔ وہ برابر لکھتے ہیں اور بہت لکھتے رہتے ہیں لیکن اس بھیڑ میں اچھی کہانیاں کم نظر آتی ہیں لیکن جو ہوتی ہیں ان کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ واقعی اچھی کہانیاں ہوتی ہیں جن کو نظر انداز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ۷۰ء کے بعد انھوں نے بہت کہانیاں لکھی ہیں اور اس سلسلے میں ان کا اہم مجموعہ لیکن ہے۔ اکیس[۲۰] کہانیوں کے اس ضخیم مجموعے میں ایک ٹائپ کی کہانیاں ہیں۔ کمار پاشی بھی یہی کہتے ہیں۔

"جوگندر پال بھی رام لعل کی طرح بہت لکھتے ہیں اور مختلف قسم کی کہانیاں لکھنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔ آپ کسی بھی سطح کا ادبی پرچہ اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ یہ دو نام آپ کو ضرور نظر آجائیں گے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مختلف رسالوں کی ضرورت کے مطابق کہانیاں لکھنا ان کا پیشہ ہے ...... زیر نظر مجموعہ کی دس کہانیوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ ایک ہی اسلوب میں لکھی گئی ہیں اگر انھیں ترتیب دے کر ایک عنوان کے تحت طویل کہانی کے طور پر شائع کر دیا جائے تو ان کے جوڑ شاید نظر نہیں آئیں گے۔"

(سطور مارچ اپریل ۷۸ء)

بہت دنوں کے بعد کمار پاشی سے اتفاق کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔ اسی طرح سے احساسات میرے ذہن میں بھی گذرے تھے اور میرے لئے یہ مشکل آن پڑی تھی کہ میں کون سی کہانی لوں جو ذرا الگ ہو۔ اس تلاش میں مجھے دو تین کہانیاں نمایاں طور پر نظر آئیں۔ عمود۔ بازیچۂ اطفال۔ کتھا ایک پیپل کی۔ بعد کی کہانی یقیناً علامت کی ایک اچھی مثال ہے۔

یہ انتخاب 'نصرت پبلشرز' کے اہتمام سے شائع ہوا ہے اور سب جانتے ہیں کہ 'نصرت پبلشرز' کے سرپرست و مالک عابد سُہیل صاحب ہیں۔ انکسار و عاجزی کے طور پر وہ اپنی کہانی کی شمولیت پر سخت معترض تھے۔ ان کی معاونت میں شائع ہونے والے انتخاب میں ان کی کہانی غلط فہمی پیدا کر سکتی تھی۔ اور اسی بنا پر مجھے بھی تامّل ہو رہا تھا لیکن گذشتہ دنوں علی گڑھ میں ہونے والے کہانی کے دو روزہ سیمینار میں انھوں نے ایک انتہائی ہلکی پھلکی، اس قدر پیاری اور ایسی اثر انگیز کہانی سنائی کہ میں نے بادلِ ناخواستہ اُس کہانی کو اُن سے چھین کر اس انتخاب میں شامل کر لیا۔ باوجود اس کے کہ ان کے مجموعے 'سب سے چھوٹا غم' میں بعض بہت اچھی کہانیاں ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی شمولیت کے امکانات بہت کم تھے۔ یہ کہانی 'سوا نیزہ پر سورج' اتفاقیہ طور پر اس انتخاب میں شامل ہو گئی اور اس طرح سے یہ ان کی غیر مطبوعہ کہانی ہے۔ کہانی نگار کی حیثیت سے عابد سہیل نے یقیناً اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں ہے کہ زبان، تکنیک کے اعتبار سے وہ نئی پود سے بالکل الگ ہیں۔ ان کا اسلوب کرشن چندر کے عہد کا اسلوب ہے۔ موجودہ عہد کے جلتے ہوئے موضوعات کو اپنی ٹھنڈی تحریروں میں ضم کر لینا ان کا خاص آرٹ ہے۔ سب سے چھوٹا غم، نوحہ گر، روح میں لپٹی ہوئی آگ، پیاسے، اندھیرے کا کرب، اور اس کے بعد سوا نیزہ پر سورج جنھوں نے پڑھا اور سنا ہے وہ میری باتوں سے اتفاق کریں گے۔

جب میں بی۔ اے (۱۹۷۲ء) میں تھا تب میں نے بار بار اپنے اساتذہ کے مسکراتے ہوئے لبوں پر سریندر پرکاش کے مجموعے، 'دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم' کا نام سنا۔ جلد ہی لائبریری سے نکلوا کر باقاعدہ اس کا مطالعہ کیا۔ آپ یقین کیجیے۔ پہلے تو میں فیصلہ نہ کر سکا یہ کس شے کا مجموعہ ہے اور اس میں کس صنف میں

بات کی گئی ہے کیونکہ میں نے کرشن چندر۔ منٹو۔ عصمت اور قاضی عبدالستار جیسے فن کاروں کی کہانیاں پڑھنے کے بعد اس گراں قدر مجموعہ کے مطالعہ کا شرف حاصل کیا تھا۔ کرشن چندر۔ منٹو وغیرہ کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ ان کہانیوں کا خالق کرشن چندر۔ منٹو سے بہت بڑا فن کار ہے یا بہت چھوٹا۔ کہانیاں لکھتا ہے یا فلسفہ بگھارتا ہے آخر کیا شے ہے، بار بار پوچھنے اور بعد میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے پیش لفظ پڑھنے کے بعد صرف یہ پتہ چل سکا کہ ہاں یہ مجموعہ کہانیوں کا ہی ہے۔ اس وقت میں بی۔ اے میں تھا۔ سوچ کر خاموش ہوگیا کہ ابھی کمزور طالب علم ہوں ایسی جدید قسم کی کہانیوں کو سمجھنے سے میری عقل قاصر ہے۔ آج چھ سات برسوں کے بعد ان کہانیوں کو کئی بار پڑھنے کے بعد بھی خیالات میں ذرا بھی تبدیلی نہ آسکی۔ آج سریندر پرکاش سے متعلق محترم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی تحریر پڑھتا ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔

"سریندر پرکاش کی تکنیک، پریم چند۔ عصمت یا بیدی سے کس طرح مختلف ہے، سب سے پہلا فرق تو وہی ہے جو تمام منطقی اور وجدانی ادب کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان افسانوں میں کہانی آگے نہیں بڑھتی بلکہ نمو کرتی ہے۔ یہ افسانہ تعمیر کیئے ہوئے نہیں بلکہ کسی پودے کی طرح بالیدہ ہیں ..... دوسرے الفاظ میں یہ افسانے زمان (TIME) میں نہیں بڑھتے، پھیلتے بلکہ مکان (SPACE) میں بڑھتے پھیلتے ہیں۔ ان کے واقعات میں زمانی تسلسل اور نقطۂ آغاز و اختتام نہیں ہے۔ یہ کوئی بنا بنایا قصہ نہیں کہتے بلکہ ان کے قصہ کی حرکت گھڑی کے پنڈولم کی طرح آگے اور پیچھے دونوں طرف اس قدر مقدار میں ہے کہ یہ ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ افسانے محض

بے پلاٹ نہیں ہیں۔ اگر پلاٹ نہ ہو لیکن کردار زمان میں حرکت کرتا رہے تو بھی افسانے کو ایک داخلی ربط میسر ہو جاتا ہے۔ ان کہانیوں کے کردار بھی کسی نقطۂ وقت پر ٹھہرے ہوئے اور اس میں گرفتار ہیں۔ اگر وہ حرکت بھی کرتے ہیں تو اپنے اپنے دھنوں کی خلاؤں میں۔ اس طرح ان کہانیوں میں ایک انوکھی بے برتی (BODYLESSNESS) پائی جاتی ہے جو بیک وقت مضطرب بھی کرتی ہے اور متحیر بھی۔"

(پیش لفظ" دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم)

فاروقی صاحب میرے بزرگ ہیں۔ میں ان کی علمیت کا معترف ہوں۔ اس مجموعے میں ان کا پیش لفظ، ان کی علمیت اور فکری سوجھ بوجھ کا مظہر ہے لیکن اس اہم اور معیاری پیش لفظ کی روشنی میں بھی ان کہانیوں کو پڑھنے کی کوشش کی تو سوائے چند خیالات ادھر ادھر تیر گئے ہوں باقی کہانیاں آج بھی میری سمجھ سے باہر ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ میری عقل آج بھی بے حد محدود ہے اور میرے نہ سمجھ میں آنے پر بعض لوگ حیرت بھی کریں گے اور تضحیک بھی اڑائیں گے لیکن میں اپنی علمی اور ناسمجھی کا آج بھی اسی طرح اعتراف کرتا ہوں جس طرح ایک شریف آدمی کسی بدمعاش کے آگے اپنی مونچھیں نیچی کر لینے میں ہی شرافت و عافیت سمجھتا ہے۔

ملاقات کے بعد سریندر پرکاش کی تحریر کے سلسلے میں جو خیالات تھے ان میں اور پختگی آتی رہی اور یہ ابھی ایک عرصہ تک قائم رہتی لیکن اچانک شعور میں بجوکا جیسی سنبھلی کہانی دیکھ کر حیرت ہوئی اور مسرت بھی۔ یہ ان کی واپسی بھی ہو سکتی ہے اور راہ راستی بھی۔ دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم میں وقتی طور پر

جو بھی ہنگامہ مچایا ہو لیکن اب اس مجموعہ کا مطالعہ صرف دیمک ہی کر رہے ہوں گے۔

بجوکا یقیناً ان کی ایک اچھی کہانی ہے اور انتخاب کے معیار پر پورے طور پر اترتی ہے اور مجھے اس کے انتخاب میں تکلف تو در کنار بلکہ مسرت ہے۔ ان کی گذشتہ کہانیوں میں اور بجوکا میں ایک گہرا تضاد ہے۔ ایسا کیوں ہ؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے جس کی تفصیل یہاں مناسب نہیں لیکن اس کے جنم میں سریندر پرکاش کے فرسٹریشن کا بڑا دخل ہے۔ آج انھیں وقت کی خوشگوار رفتار اور تقاضوں کے آگے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے۔ بجوکا کی اشاعت اس کے مستقبل کی اچھی نشان دہی کرتا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ ان کے قلم سے اس سے بھی اچھی کہانیاں جنم لیں گی۔

اقبال متین۔ اقبال مجید اور رتن سنگھ دَورِ حاضر کے نمایاں۔ کامیاب۔ کہانی کار ہیں۔ موجودہ رفتار۔ ٹیکنک۔ موضوع پر ان تینوں قلم کاروں کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ اقبال مجید کا "دو بھیگے ہوئے لوگ" ان تمام علامتی کہانیوں کے لئے ایک سبق ہے جو صرف علامت کے الجھا دینے والے چکروں میں ناچ کر قاری کے ذہن سے اوپر نکل جاتی ہیں۔ پنجرے کا آدمی۔ بچا ہوا البم اور خالی پٹاریوں والا مداری اس دور کے تین اہم کہانیوں کے مجموعے ہیں جس نے اپنے خالق کو اردو کے چند بڑے کہانی کاروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ نظریات کی گھن گرج سے دور۔ علامت۔ تجریدیت کی غلاظت سے دور خالص نئے مسائل اور نئے قسم کے خوشگوار تجربہ کرنے والوں میں ان تینوں کا نام نمایاں ہے۔ ان کی شمولیت اس انتخاب کی زینت ہے۔

اب آیئے نئی نسل کی بات کریں۔ نئی نسل سے مراد وہ نئی عمر اور نئے ذہن والے کہانی کے فن کار جنھوں نے ۷۰ء کے بعد اپنی علٰحدہ شناخت بنائی ہے۔

اگرچہ اس میں ایک بھیڑ ایسی ہے جو باوجود اس کے کہ کامیاب کہانیاں لکھ رہے ہیں لیکن ابھی تک مقام نہیں بنا سکے ہیں۔ دراصل رسالوں کی بھیڑ میں ادھر ادھر بکھری ہوئی کہانیاں قاری کے ذہن میں وہ شکل نہیں بنا پاتیں جو مجموعے کی اشاعت کے بعد بنتی ہے اور تب ہی اچھے اور برے کا فیصلہ ہو پاتا ہے۔ نئی نسل میں لکھنے والوں کی ایک بھیڑ ہے جن میں چند نام یہ ہیں۔ سلام بن رزاق۔ انور خاں۔ شوکت حیات۔ انور قمر۔ قمر احسن۔ شفق۔ عبد الصمد۔ حسین الحق۔ حمید سہروردی۔ علی امام۔ رضوان احمد۔ م۔ ق۔ خان۔ انیس رفیع۔ شمس الحق عثمانی۔ سجاد عزیز۔ احمد عثمانی۔ شارق ادیب۔ شمس ندیم۔ اظہار الاسلام۔ سید محمد اشرف۔ غیاث الرحمٰن۔ طارق چھتاری۔ مسلم سلیم وغیرہ وغیرہ……

ان میں بعض نوجوان ایسے ہیں جن کی ابھی صرف دو چار کہانیاں شائع ہوئی ہیں لیکن جن سے آگے امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ غیاث الرحمٰن۔ طارق چھتاری۔ علی گڈھ کی فضا میں پنپنے والے وہ نوجوان فنکار ہیں جن کے اندر بڑے سلیقے سے کہانی لکھنے کا خمیر اٹھ رہا ہے۔ غیاث الرحمٰن کی کہانی وہ دن ادبی حلقوں میں کافی پسند کی گئی۔ مسلم سلیم کی کہانیاں سکھ کی نیند۔ آگہی وغیرہ ان کی اچھی شروعات ہیں۔

شارق ادیب اور سید محمد اشرف کی کہانیاں ترقی پسندیت کی طرف مائل ہیں۔ باوجود اس کے کہ یہ لوگ ہر طرح کا تجربہ کر رہے ہیں۔ لیکن ذہنی طور پر یہ لوگ ترقی پسند ہیں۔ شارق کی کہانی غبارِ محمل اور اشرف کی کہانی ڈار سے بچھڑے میں کرشن چندر و قاضی عبد الستار کے اثرات ملتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں نیا ذہن کام کر رہا ہے۔ نئی فکر اور نیا سوچنے کا انداز شامل ہے۔ یہ دونوں بھی خالص علی گڈھ کی پیداوار ہیں اور اچھی صلاحیت کے مالک ہیں۔ اگر یہ خاموش نہ ہو گئے تو ان سے بڑی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ان کی کہانیاں پہلی بار انتخاب میں شامل ہو رہی ہیں۔

سلام بن رزاق۔ انور خاں۔ شوکت حیات۔ انور قمر۔ حسین الحق۔ شفق اور عبد الصمد
نے وہ حیثیت بنالی ہے کہ ان کا شمار جدید دور کے نمایاں ناموں میں ہونے لگا ہے۔ اب کہانی
کا ارتقا ان ناموں کے بغیر ممکن نہیں۔ ان میں سلام بن رزاق۔ انور خاں اور انور قمر کے
مجموعے بالترتیب ننگی دوپہر کا سپاہی۔ راستہ اور کھڑکیاں اور چاندنی کے سپرد کے نام
سے شائع ہو چکے ہیں۔

یہ تینوں مجموعے اُن کہانی کاروں کے لئے ایک طنز اور سبق ہے جو ایک عرصہ سے لکھتے
چلے آرہے ہیں۔ لیکن اپنے مقام کو حاصل نہ کرنے کا رنج اب انھیں کھائے جارہا ہے اور ان میں
ایک طرح سے جھنجھلاہٹ پیدا ہو چلی ہے۔ تینوں مجموعے انتہائی خاموشی سے شائع ہو کر اسی
خاموشی کے ساتھ اپنا مقام حاصل کر رہے ہیں۔ جنھوں نے سلام بن رزاق کو پڑھا ہے۔
زنجیر ہلانے والے۔ کالے ناگ کے پجاری۔ بجوکا۔ ننگی دوپہر کا سپاہی اب بھی ان کے ذہن میں
گونج رہی ہوں گی۔ اسی طرح انور خاں کی کہانیوں میں کوّوں سے ڈھکا آسمان۔ جھیڑیں۔ لمبا
آدمی۔ انتظار۔ شکستگی جیسی کہانیاں یادگار ہیں۔ انور قمر کی کہانیوں میں ہاتھیوں کا قیدی۔
جیک اینڈ جیل اور میرا بیٹا۔ گرمی میں ان کا فن عروج پر ہے۔ میری ان باتوں میں مبالغہ
کی بو آسکتی ہے لیکن میں کھلے دل سے اس وجہ سے تعریف کر رہا ہوں کہ ان کہانیوں نے
تھوڑے وقت میں ہی قارئین پر اپنی فنکاریت کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ بیجا طوالت۔ پیچیدگی۔
الجھاؤ اور فضول قسم کے تناؤ سے بالکل دور یہ کہانیاں ایک طرف تو رام لعل و جوگندر پال
جیسے کثرت نویس و زود نویس کہانی کاروں پر طنز کرتی ہیں۔ دوسری طرف بلراج مین را اور
سریندر پرکاش جیسے لوگوں کے لئے سبق بھی ہیں۔ اپنے سے کم عمر کہانی کاروں کی مقبولیت
و نصرت دیکھ کر ہی ان لوگوں کے ذہن میں ایک طرح کی جھنجھلاہٹ پیدا ہو چلی ہے جس کا
خوبصورت ردِ عمل سریندر پرکاش کے قلم کے ذریعہ بجوکا میں نظر آیا۔ اب زیادہ دیر نہیں
مین را بھی راہِ راست پر آجائیں گے نہیں تو صاف ہو جائیں گے۔ یہ واویلا۔ یہ شور و غل

بہت جلد دور ہونے والا ہے اور دور کریں گے یہ نوجوان فن کار۔ بس ذرا وقت گذرنے دیجیے۔ وقت جو بڑا ظالم ہے لیکن بڑا منصف اور بہت بڑا نقاد بھی۔

عبدالصمد۔ شوکت حیات۔ حسین الحق۔ شفق۔ رضوان احمد۔ حمید سہروردی۔ نئی نسل کے وہ نام ہیں جو پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی جولانیاں دکھا رہے ہیں۔ ہر چند ان میں سوائے رضوان احمد کے کسی کا مجموعہ نہیں آیا لیکن ان میں شوکت حیات کی سچویشن سیریز۔ ڈھلان پر رکے ہوئے پاؤں۔ کہ وغیرہ۔ حسین الحق کا خارسپ۔ آتم کتھا اور اندھی دشاؤں کے سائے وغیرہ۔ عبدالصمد کی کہانیاں اوس اور کرن۔ نہیں۔ کال بیل۔ بت۔ بارہ رنگوں والا کمرہ وغیرہ۔ شفق کی کانچ کا بازیگر۔ سیاہ کتا۔ بچا ہوا گلاب وغیرہ۔ حمید سہروردی کی کہانی۔ سو برس۔ رضوان احمد کی مسدود راہوں کے مسافر وغیرہ بہت اچھی کہانیاں ہیں جو ہندوستان کے تمام معیاری جریدوں میں شائع ہو چکی ہیں اور پسند کی جا چکی ہیں۔

قمر احسن وہ کہانی کار ہیں جن کے فن نے خالص جدیدیت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اس سے قبل الہ آباد۔ لکھنؤ کی ادبی صحبتوں میں چنگھاڑ چنگھاڑ کر جدیدیت کا اعلان کرتے رہے اور علم اٹھاتے پھرتے رہے۔ اس کے باوجود بھی جب کسی نے زیادہ نوٹس نہ لی تو اب چنگھاڑ جھنجھلاہٹ میں تبدیل ہو چکی ہے جس کے جابجا اشارے ان کی تحریروں میں نظر آجاتے ہیں جو خط کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ درمیان میں خاموش ہو گئے ادھر پھر سے لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب بھوپال میں ہیں اور وہیں سے سارے ہندوستان کے بزرگوں اور اپنے ہم عصروں کو للکارا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کا ادبی قد زیادہ لمبا ہے باقی سب بونے ہیں۔ یہ فیصلہ وہ خود ہی کر بیٹھے۔ حالانکہ ان کے ہم عصروں میں ان سے اچھی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ سلام بن رزاق، شوکت حیات اور انور قمر کی کہانیوں کی مثال واضح طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اب ان کی حیثیت

کا فیصلہ ان کا مجموعہ ہی کرے گا جو جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔

کچھ ایسے ہیں جو ذہنی طور پر فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ انھیں کس راستے پر جانا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ تخلیق کی عمارت آرٹ اور کمٹمنٹ کے گارے سے مل کر کھڑی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہیں جو نوجوانوں کی بھیڑ میں انفرادیت حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی شکلیں اختیار کر رہے ہیں اور اپنے آپ پر کہانی کے جدید ترین لبادہ کو اس انداز سے اوڑھ رکھا ہے تاکہ ان کی شکل نکھر آئے اور لوگ چونک کر انھیں دیکھنے لگیں۔ یہ ان کی بھول ہے۔ پیچیدگیوں کے دلدل میں پھنسی ہوئی یہ کہانیاں اگر اپنی تحریر اور اپنے موضوع میں دم نہیں رکھیں گی تو کبھی زندگی نہ پا سکیں گی۔ کہانی زندہ رہتی ہے اپنے فن اور اپنے کہانی پن کی وجہ سے۔ جدیدیت کے بے تکے پن سے نہیں۔ ابھی تک کہانیوں کی کچھ ایسی ہی روایت ہے۔ کل کیا ہوگا۔ کہا نہیں جا سکتا۔

تین پاکستانی کہانیوں کی وجہ سے رضوان احمد۔ انیس رفیع۔ حمید سہروردی۔ کی کہانیاں اس میں شامل نہ ہو سکیں۔ جس کا مجھے افسوس ہے۔ بہر حال اس انتخاب میں شمولیت ان کی آخری منزل قطعی نہیں ہے۔ انھیں ان تمام آلودگیوں سے بالکل الگ اور آج کی دھندلی فضا سے بالکل پرے صرف خوبصورت، معیاری اور موجودہ زندگی و سماج کے تقاضوں میں ڈوبی ہوئی کہانی لکھتے رہنا ہے تاکہ اُردو کہانی کا سفر آگے بڑھتا رہے اور اس سفر میں ہماری نسل کا خاطر خواہ رول ہو۔ میں یہ بات نصیحت کے طور پر نہیں بلکہ جذباتی ہو کر کہہ رہا ہوں۔

بزرگوں میں بعض معتبر اور قابلِ ذکر کہانی لکھنے والوں کا اس میں ذکر نہیں کر سکا ہوں۔ اس کی وجہ یا تو انتخاب کے اصول ہیں یا بعض دیگر مجبوریاں۔

براج مین را جن کو حلقۂ مین را اس دور کا سب سے بڑا کہانی کار مانتے ہیں اور منوانے کے لئے ہر طرح کی کوششیں بھی کر رہے ہیں۔ شعور (مین را نمبر) کی اشاعت۔ اس میں ہندوستان کے بعض نامور فن کار کی غیر موجودگی "منٹو کے بعد مین را"۔ منٹو سے لے کر مین را کے درمیان تمام فن کاروں کی صلاحیت سے انکار ____ پھر عہدِ حاضر کی کیا مجال! غالب کے دور میں غالب کے مقابلہ میں 'ہد ہد الشعراء' کو بھی اسی طرح بانس پر چڑھایا گیا تھا اور اب کرشن موہن کو سب سے بڑا شاعر منوانے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلے جا رہے ہیں۔ بہر حال مجھے مین را کو کہانی کار تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے۔ آپ کہیں گے آپ کی حیثیت کیا ہے۔ یہ سچ ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرا خیال ہے انھوں نے صرف ایک کہانی لکھی ہے ذ ہ اور وہ بھی ۷ برس سے بہت پہلے اور صرف ایک کی بدولت اس کا خالق کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ جب تک کہ تخلیق بے حد غیر معمولی نہ ہو۔ شاید یہ کہانی بھی کسی حادثے کے طور پر ہو گئی ہے ورنہ مین را کہانی کار۔ خیر چھوڑئیے۔ ہاں مدیر بہت اچھے ہیں۔ ____ ظلمت۔ مقتل۔ ریپ اور کمپوزیشن کی تمام قسطیں۔ بڑے بڑے نقادوں کی نظروں میں کہانیاں ہو سکتی ہے۔ لیکن مجھ جیسے طالب علم اور معمولی قاری کی نظر میں نہیں اور نہ میں کہانی کے لئے نقادوں کے وضاحتی نوٹس کو جائز سمجھتا ہوں۔ کہانی تو وہ ہے جو کہانی کار کہے اور بالکل اسی تاثرات کے ساتھ ساتھ قاری کے دل و جگر میں اتر جائے۔ مین را کی کہانیاں دل و جگر میں کیا دماغ میں بھی نہیں اترتیں۔ کم از کم اس دنیا کے اہلِ دماغ میں قطعی نہیں۔ ہاں تیسری دنیا کے دماغوں میں ہو سکتا ہے اتر جائیں۔ شعور یا اس سے بھی دگنی کتاب چھاپ دی جائے۔ لیکن کہانی زندہ رہتی ہے۔ اپنی کہانی پن کے آرٹ پر۔ اپنی ترسیل کی فنکاریت پر ورنہ وقت کے سیلاب میں سب بہہ جائیں گے۔ بڑے بڑے بہہ گئے۔ آج کا تنا ی

جو بظاہر تو معصوم اور بے وقوف ہے لیکن فیصلہ وہی کرتا ہے اور اس کے فیصلے
کے آگے سب کو سر جھکانا پڑتا ہے۔

کہانی کی نئی نسل اور پرانی نسل کے کامیاب اور ناکامیاب تجربوں کی
بنا پر کہانی تھیم۔ ہئیت۔ رویہ اور اسلوب کے اعتبار سے بے شمار مسائل میں گھر کر
چوراہے پر آکر کھڑی ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کی رفتار کے ساتھ ساتھ
کہانی کے موضوعات اور مسائل میں فرق آیا ہے اور یہ فطری بھی ہے۔ زندگی بے حد
نامیاتی شے ہے۔ تمام تبدیلیوں کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ ادب جو زندگی
کا مظہر ہے ایسی تبدیلیوں اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والے تمام موضوعات کے
لئے اس کے دروازے ہمیشہ کھُلے رہتے ہیں۔ کہانی جس کی بنیاد پریم چند نے ڈالی۔
منٹو نے اپنی تیکنکی ذہانت سے اس پودے کو بالیدگی بخشی۔ کرشن چندر۔ عصمت نے
زندگی کے خاص موضوعات کا انتخاب کرکے اپنے اپنے انفرادی اسلوب سے اس کو
ایسی جِلا بخشی کہ کہانی ایک طرف سے سب کی توجہ کی مرکز ہو گئی۔ جب چاروں
جانب سے ہر ایرا غیرا نتھو خیرا اس میدان میں گھُس آیا۔ نتیجہ کے طور پر بیسویں صدی
کی ساتویں۔ آٹھویں دہائی تک کہانی کے سلسلے میں خوب اوٹ پٹانگ تجربے
ہوئے اور آج بھی کہانی اسی تگ ودو میں ہے کہ وہ کون سی سمت اختیار کرے
جہاں اس کا مستقبل روشن وتابناک ہو سکے۔

جدید کہانی میں بہت سے کامیاب تجربے بھی ہوئے جس کی اہمیت سے انکار
نہیں۔ نئے عہد کے نئے تقاضوں کو جس انداز سے اس صنف نے اپنی آغوش میں جذب
کیا ہے کوئی اور صنف نہ کر سکی۔ نئے مسائل کے ساتھ ساتھ نئی حسیت۔ نیا
ذہن۔ نیا سوچنے کا انداز' نیا اسلوب کہانی میں زیادہ اُبھرا اور کامیابی کے ساتھ

اُبھرا۔ بات یہاں تک رہتی تو حقائق سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن بات تو کچھ اور ہونی تھی۔ رفتہ رفتہ کہانی کا تعلق علامت اور صرف علامت۔ تجرید اور صرف تجرید سے ہو کر رہ گیا اور اس کی سطح پر ایسے ایسے تجربے ہوئے کہ قاری محوِ حیرت اور دریائے تحیّر و استعجاب میں غرق ا یہ تحریریں کس قدر صداقت آمیز ہیں:۔

"علامت (صرف علامت) اور تجرید (صرف تجرید) کی گردش نے جدید افسانہ کو خلاء میں اُچھال دیا۔ شعور کی رو بھٹک گئی ۔ پیچیدگی۔ جدید افسانہ کی باگ اور خود ساختہ انفرادیت کا رکاب بن گئی ہے اور جدید افسانہ ہزار جھالروں اور پیوندوں میں اُلجھ کر اپنی شناخت بھول بیٹھا۔"

(اداریہ۔ ہم زبان۔ ۴)

کہانی کاروں کی کچھ نئی شکلوں کے ذریعہ کہانی عوامی، سماجی اور تہذیبی مسائل سے ہٹ کر بالکل اپنی ذات کے اندھیرے میں بھٹک بیٹھی ہے۔ آج جب کہ موضوعات کا انبار ہے۔ ایسے کہانی کاروں کا خیال ہے :۔

"آج کسی عظیم افسانے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسے صرف شعلۂ مستعجل کی طرح دیکھیے اور پھر آگے دوسرے موڑ کے لئے تیار ہو جائیے۔ نہ عظیم موضوع رہ گئے ہیں اور نہ ہم میں اظہار کی قوت۔ اسی لئے علامتی اظہار کا رنگ اختیار کیا ہے۔"

(جدید افسانہ اور اس کے مسائل از ڈاکٹر سید محمد عقیل)

جہاں پہلی بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے وہیں دوسری بات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ اس احساس نے آج کی کہانی کو علامتوں کے بھنور میں ایسا پھنسا دیا ہے کہ کبھی کبھی تو یہ خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں اس کا دم نہ گھٹ جائے۔ قاری کو

کیا اس کو تو وہی کہانیاں پسند آئیں گی جو اس کو سمجھ میں آئیں گی اور اس کو وہ دل میں اتار سکے گا۔

کیا یہ علامتی اور تجریدی کہانیاں۔ کہانی کے مستقبل کے لیے نیک فال ہیں۔ میں کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا، لیکن نوجوانوں کی وہ نسل جس کا براہ راست تعلق مجھ سے ہے وہ ان کہانیوں کو کیسی کڑوی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور لکھنے والوں کی نئی نسل کس طرح گم راہ ہو رہی ہے اس کو دیکھ کر اس کے خلاف آواز ضرور اٹھا سکتا ہوں۔ علامت تجریدیت یہ سب وہ الفاظ ہیں جو آج کے قاری کے لئے دردِ سر بن کر رہ گئے ہیں۔ آج سے قبل کیا ہمارے کسی فن کار نے علامتوں کا استعمال نہیں کیا تھا۔ احمد علی، منٹو اور کرشن چندر کی علامتی کہانیاں کامیاب تجربے نہیں تھے۔ لیکن یہ وہ علامتیں تھیں جن کو قاری آسانی سے میٹھے شہد کی طرح حلق کے نیچے اتار لیتا تھا۔ لیکن آج کی علامتیں اور اس میں ڈوبی ہوئی یہ کہانیاں اپنے قارئین کی تعداد کس قدر گھٹا رہی ہیں۔ اس پر کیا کسی نے غور کیا ہے۔ کہانی کہاں جلائے گی۔ اس کی فکر کہاں ؟ علامتوں کے سلسلے میں شمس الرحمن فاروقی کے یہ جملے ملاحظہ ہوں جو انھوں نے سریندر پرکاش کی کہانیوں میں استعمال شدہ علامتوں کے بارے میں لکھا تھا:۔

"یہ تمثیل (SYMBOLS) اساطیری۔ ذاتی یا مذہبی نہیں ہیں۔ بلکہ خواب کی دنیا سے مستعار لی گئی ہیں۔ خواب میں لاتعداد صورتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں اور ان گنت مادی اشیاء ہر طرح کے غیر متوقع روپ دھارتی رہتی ہیں۔ لیکن خواب دیکھنے والے کو حیرت نہیں ہوتی۔ ہم تمام شکلیں اپنی لاشعوری یا تحت الشعوری اصل بھی رکھتی ہیں۔ (DREAM SYMBOLS) کا بنیادی اس کی واقفیت

ہے جو انتہائی غیر واقعی شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔"
(پیش لفظ دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم)

یہ تحریریں قابلِ غور ہیں، لیکن کیا سریندر پرکاش نے ان علامتوں کو بالکل اسی طرح استعمال کیا ہے جیسا کہ فاروقی صاحب فرماتے ہیں یا ڈاکٹر شمیم حنفی صاحب چھلاوہ میں مین را کے افسانوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ شمیم حنفی۔ محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ کی تحریریں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کہانیاں واقعی ایسی کہانیاں ہیں جو بالکل سمجھ سے باہر ہیں۔ اسی لئے اس میں کہانیوں کے ساتھ مضامین کا یہ دُم چھلا بھی لگنے لگا ہے۔ لیکن یہ کب تک؟ اس کا مطلب کہانی کا مقام اور اس کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ چند نقاد کیا کریں گے قاری نہیں جب کہ اصول یہ کہتا ہے کہ فن کار کا مقام قاری کے دل میں ہوتا ہے نقاد کے قلم میں نہیں۔ گفتگو میں علامت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے لکھا تھا:۔

"ڈاکٹر عقیل کا یہ خیال غلط نہیں کہ جدیدیت اور نئی علامت نگاری کے پس پشت جو تحریک رہی ہے اس کا مقصد ادب کی عصری زندگی کی آگہی اور سیاست سے منقطع کرکے ایک زیادہ گہری سیاست کا آلۂ کار بنانا تھا۔ ادب کو مجہول اور بے اثر بنا کر اس کی فعالیت کو ختم کرنا اور اسے اشتراکی خیالات اور نظریات کے اثر سے آزاد کرنا تھا۔"

(گفتگو)

علامت و تجریدیت کا یہ پیچیدہ چکر سو فیصدی ڈاکٹر عقیل صاحب کے خیالات

سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

کیا قاری ایسی کہانی کو پسند کر رہا ہے؟ اس سوال کے پردہ میں جھنجلاہٹ نہیں بلکہ کہانی کے سلسلے میں میرا ازم اور جذباتی رویہ ہے اور میری نظر کہانی کے اس پس منظر پر ہے جہاں اسے کرشن چندر۔ بیدی۔ عصمت نے لاکر چھوڑا ہے۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ بعض نوجوان فن کار اس رویہ میں بہک رہے ہیں۔ ہمارے قارئین کی توجہ بیزاری کے ساتھ کسی اور طرف گامزن ہو رہی ہے اور کہانی عام آدمی سے ہٹ کر اُلجھے ہوئے ذہنوں میں سمٹتی جا رہی ہے تو کیا ایسی کہانی زندگی پا سکے گی؟ یہ ایک سوال ہے جس کو میں اٹھاتا ہوں اور راجیندر سنگھ بیدی کے اِن جملوں کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں:-

"ایسی کہانی لکھنے کا فائدہ ہی کیا فادر! جسے چھوتے ہی ہر نتھو خیرا سمجھ جائے۔ اگر ان کے چہروں پر ناسمجھی کے نقوش دیکھتا ہوں تو مجھے یقین آجاتا ہے۔ یہاں اب بات بنی۔ جب ہی اسی وقت لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ کہانی بے حد کامیاب ہے کیونکہ وہ میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی جو کہ میرے نزدیک فن کی معراج ہے۔ دیکھئے تو دنیا بھر کا آرٹ بھی ناولوں میں مصوّری اور کیا تعمیر سب کدھر جا رہے ہیں؟ اور ہم ابھی تک مطلب کے چکّر میں پڑے ہیں۔ میں مطلب کی پرواہ نہیں کرتا اور اگر کرتا بھی ہوں تو بہت بعد۔ میں لوگوں کو کہانی کے بارے میں لے دے کرنے دیتا ہوں، ناسمجھی کے الزام سے ڈرتے ہوئے وہ خود ہی معنی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں!!"

(ہاتھ ہمارے قلم ہوئے)

مخلص و ترقی پسند نقاد ڈاکٹر سید محمد عقیل صاحب کے
ش لفظ نے بلاشک و شبہہ اس انتخاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں ان کا شکریہ
کیسے ادا کروں۔ میں ان کا شاگرد ہوں وہ میرے استاد۔ میرے قلم میں جو بھی
قت اور فکر میں جو بھی گرمی ہے وہ انھیں کی دین ہے۔ میں ایک قدم بھی آگے
بڑھ پاتا اگر ان کے اہم مشورے میرے ساتھ نہ ہوتے۔

اس دور گرانی میں جہاں بڑے بڑے ادیبوں کی کتاب کی اشاعت کے
سلسلے میں پبلشر ایک بار ضرور سوچتا ہے۔ برادرم بزرگ عابد سہیل صاحب
ے مجھ جیسے حقیر کی ادبی کوشش کی اشاعت کی ذمہ داری لے کر ایک بہت
ڑا خطرہ مول لیا ہے۔ میں ان کی اس شفقت اور کرم فرمائی کو تا زندگی فراموش
ہیں کر سکتا۔ عابد سہیل صاحب نے ہمیشہ نوجوانوں کی ہمت افزائی کی ہے۔

ان تخلیق کاروں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری استدعا پر اپنی تخلیقات
کو بھیج کر انتخاب میں آسانی پیدا کی۔ شارق ادیب نے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں
ے حد مدد کی۔ وہ میرے بہت اچھے دوست ہیں، ان کا شکریہ ادا کرنا دوستی کا تقاضا
ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کہانی کاروں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے
متعدد خطوط کے بعد بھی کوئی نوٹس نہیں لی لیکن میں نے اس کے باوجود ان کی کہانی کی
مولیت میں ذرا بھی تکلف نہیں کیا۔

اس انتخاب کے سلسلے میں اہل ادب کے مشوروں کا بے چینی سے منتظر
ہوں گا۔

۶۸ مرزا غالب روڈ
الہ آباد

علی احمد فاطمی
جولائی ۷۸ء

چند عمدہ افسانوی مجمو

سب سے چھوٹا غم	عابد سہیل	۸ روپ
کل کی باتیں	رام لعل	۷ روپ
سچ کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	۷ رو
دو بھیگے ہوئے لوگ	اقبال مجید	۷½ روپ
نُچا ہوا البم	اقبال متین	۷½ رو
پہلی آواز	رتن سنگھ	۵ روپ
رسائی	جوگندر پال	۵½ رو
دو غنڈے	مظفر حنفی	۵ رو

طنز و مزاح

فٹ نوٹ	یوسف ناظم	۵ روپ
ستم ایجاد	احمد جمال پاشا	۷ روپ

نصرت پبلشرز کپور مارکیٹ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ